"Maharaja kishan Persahd Shaad ke Novelon main Hyderabadi Tahzeeb ka Mutalea"

(A Study of Hyderabadi Culture as Depicted in the Novels of Maharaja Kishan Pershad Shaad)

THESIS

Submitted to the University of Hyderabad for Partial fulfilment of the requirement for the award of

DOCTOR OF PHILOSOPHY
IN URDU

Submitted

By

Nazmunnisa
Reg.No: 10HUPH01

Under the Supervision
Of
Dr. MOHD KASHIF

Department of Urdu, School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad 500 0046

2017

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کے ناولوں میں حیدرآبادی تہذیب کا مطالعہ

مقالہ برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو)

مقالہ نگار

نجم النساء

Reg.No: 10HUPH01

نگران کار

ڈاکٹر محمد کاشف

شعبۂ اردو، اسکول آف ہیومانیٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد،

حیدرآباد، 500046

2017

Department of Urdu
School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad

CERTIFICATE

This is to certify that thesis entitled **“Maharaja kishan Persahd Shaad ke Novelon main Hyderabadi Tahzeeb ka Mutalea”** submitted by **Ms. Nazmunnisa** bearing Registration. No. **10HUPH01** in partial fulfillment of the requirement for award of Doctor of Philosophy in the School of Humanities is a bonafide work carried out by her under my supervision and guidance.

This thesis is free from plagiarism and has not been submitted previously in part or in full to this or any other University or Institution for award of any degree or diploma.

Parts of this thesis have been:

A. Published in the following publications:
   1. “Hyderabad ka pehla mahwar Risala” Mahanama “Bazm-e-Aaina “Kurnool, January 2014, Issu-1, Vol 4 ISSN 2347-2936 P-No: 17-19
   2. “Deccan Ratan Maharaja Kisan persha shad Shaad”, “Hindustani Zaban”, Saa mahi Risala, Mumbai, April-June 2014, P.No: 36-38, ISSN: 0378-3928.

B. presented in the following Seminars:
   1) “Presented a paper titled “Ameer menai ki ghazal goi” in one day Symposium on “Hazrat Ameer menai-Life and his contribution to Urdu language and literature” in April 17, 2013: conducted by Department of Urdu, university of Hyderabad.
   2) “Presented a paper titled “Gopi chand narang ki nazriyati tanqeed” in three day international Seminar on “Theoretical Criticism in Urdu: Background and foreground” from 11-13 February 2014, Conducted by Department of Urdu, University of Hyderabad.

Further, the student has passed the following courses towards fulfillment of coursework requirement for Ph.D / was exempted from doing coursework (recommended by Doctoral Committee) on the basis of the following courses passed during her M.Phil. Program and the M.Phil degree was awarded:

	Course Code	Name	Credit	Pass/Fail
1.	HU600	Research Methodology	4	Pass (B+)
2.	HU601	Practical Criticism	4	Pass (B)
3.	HU602	Textual Criticism	4	Pass (B)
4.	HU680	Dissertation	12	Pass (A)

Supervisor **Head OF Department** **Dean of School**

Department of Urdu,
School of Humanities,
University of Hyderabad.
Hyderabad - 500 046.

DECLARATION

I, **NAZMUNNISA**, hereby declare that this thesis entitled **"MAHARAJA KISHAN PERSHAD SHAAD KE NOVELON MAIN HYDERABADI TAHZEEB KA MUTALEA" (A Study of Hyderabadi Culture as Depicted in the Novels of Maharaja Kishan Pershad Shaad).** Submitted by me under the guidance and supervision of **Dr. MOHD KASHIF**, is a bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or in full to this University or any other Institutions for award of any degree or diploma. I hereby agree that my thesis can be deposited in shodganga/INFLIBNET.

Date:

Name: Nazmunnisa

Signature of the Student

Regd. No: 10HUPH01

فہرست

پیش لفظ	2
باب اول	7
مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد سوانح و شخصیت	
باب دوم	40
حیدرآبادی تہذیب کے نمایاں پہلو	
باب سوم	97
مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے ناولوں کا اجمالی جائزہ	
باب چہارم	126
مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کے ناولوں میں حیدرآبادی تہذیب کا مطالعہ	
اختتامیہ	238
کتابیات	244
بنیادی ماخذ	
ثانوی ماخذ	

پیش لفظ

پیش لفظ

ذوقِ پاکیزہ ہے ہر چیز ہے پُر لطف و حسین
یہ نہ حاصل ہو تو بے کار ہے دنیا ہو کہ دین

اللہ تعالیٰ کا بے حد اور بے انتہا شکر سب سے پہلے ادا کرتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ بہتر علم والا ہے۔ وہ علیم ہے اور اسی کے حکم سے ہر کام انجام پاتا ہے۔ اور یہ اسی کا فضل و کمال ہے کہ مجھے تحقیقی کام کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور یوں یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔

مجھے بچپن سے تعلیم کا بہت شوق ہے۔ میں نے اس کے لئے بے حد محنت اور جد و جہد کی۔ تعلیم حاصل کرنا میرے لئے بہت کٹھن مرحلہ تھا۔ میرے والدین کو میری بہت فکر رہتی تھی کہ میں اس کٹھن مرحلہ سے کیسے گزروں گی۔ اور میں نے بہت محنت و ہمت سے تعلیم کے سفر کو آگے بڑھایا۔ اس کٹھن مرحلہ کو میرے خدا نے میرے لئے آسان کر دیا۔ میرے بچپن کے استاد فضل الرحمٰن عرف اکمل حضرت کہا کرتے تھے کہ ہمت اور حوصلہ ہو تو دنیا میں ہر کام آسان اور ممکن ہو جاتا ہے۔ انھیں کی حوصلہ افزائی سے میں نے اپنی تعلیم سلسلے کو آگے بڑھایا۔

ایم۔اے اردو کی تعلیم کے بعد شعبۂ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی میں ایم۔فل میں میرا داخلہ ہوا۔ میرے استادِ محترم ڈاکٹر حبیب نثار صاحب کی نگرانی میں ''گوپی چند نارنگ کی دکنی خدمات'' کے عنوان کے تحت ایم۔فل کی ڈگری حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اس کے بعد میں نے پی۔ایچ۔ڈی میں داخلہ لیا۔ پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ ''مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کے ناولوں میں حیدرآبادی تہذیب کا مطالعہ'' طئے پایا۔

حیدرآباد میں اردو ناول نگاری کی ابتدا مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے ناولوں سے ہوتی ہے۔ شاد نے رتن ناتھ سرشار ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر کے ناولوں سے متاثر ہو کر ناول نگاری کی ابتدا کی۔ انہوں نے چار ناول

لکھے۔اور ایک مختصر قصہ بھی تحریر کیا۔ چار ناولوں میں صرف تین ناول ہی دستیاب ہو سکے ہیں۔ان کے ناول لکھنے کا مقصد معاشرتی اور اخلاقی اصلاح تھا۔مہاراجہ کی شناخت دراصل ناول نگار کی حیثیت سے نہیں ہے۔ انہوں نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔شاعری کی تمام مروجہ اصناف میں اپنی تخلیقات پیش کیں۔مثنوی،قصیدہ،غزل،مرثیہ قطعات وغیرہ میں ان کے تخلیقی اظہار کے نمونے ملتے ہیں۔ان کی شاعری متنوع انداز کی حامل ہے۔زبان پر قدرت کی بنا پر اپنی شاعری کو کسی ایک رنگ میں محدود نہیں کیا۔نثر کی طرف متوجہ ہوئے تو تمام مروجہ رویوں کو ذہن میں رکھا۔اسی طرح قصہ نگاری لکھنے کی طرف مائل ہوئے تو چار ناول تخلیق کر ڈالا۔اس تنوع پسندی کا نقصان یہ ہوا کہ کسی مخصوص صنف میں ان کی شناخت نہیں بن سکی۔ہمیں یہاں ان کی ناول نگاری سے بحث ہے۔ انہوں ایک قصہ اور چار ناول لکھ کر حیدرآباد میں اردو ناول نگاری کے لئے راہ ہموار کیا۔جس وقت انہوں نے ناول نگاری کی ابتدا کی اس وقت اردو ناول اپنے ابتدائی دور سے گزر رہا تھا۔ڈپٹی نذیر احمد،سرشار،اور عبدالحلیم شرر کے ناولوں کے نمونے ان کے سامنے تھے۔موضوعاتی سطح پر وہ نذیر احمد سے متاثر ہو کر اصلاح معاشرہ و اخلاق کے لئے ناول لکھا۔انداز بیان کے اعتبار سے ان کے ناولوں میں سرشار کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔فنی اعتبار سے ان کے ناول بلند پایۂ کے نہیں ہیں۔لیکن ان کے ناولوں میں حیدرآبادی معاشرت وتہذیب کی جھلک دکھائی دیتی۔جس کو اجاگر کرنے کی میں نے اس مقالے میں کوشش کی ہے۔ اردو ناول کی تاریخ میں ان کی ناول نگاری کا تذکرہ یا تو نہیں ملتا ہے۔اگر کہیں تذکرہ ملتا ہے تو بہت ہی مختصر طور پر یا پھر کچھ غلط فہمیاں بھی ان کی ناول نگاری کے حوالے سے راہ پا گئی ہیں جن کو میں نے اس مقالے میں دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے ناولوں کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ مہاراجہ کے اندر ناول نگاری کی صلاحیت واہلیت موجود تھی۔

مہاراجہ کشن پرشاد شآد کے ناولوں پر اردو کے کسی ریسرچ اسکالر نے تحقیق نہیں کی اور نہ کسی نے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔استادِ محترم ڈاکٹر حبیب نثار صاحب کے مشورے سے میرا موضوع ''مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے ناولوں میں حیدرآبادی تہذیب کا مطالعہ'' طے پایا۔

مقالہ کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

بابِ اوّل: کشن پرشاد شآد:سوانح وشخصیت۔اس باب میں کشن پرشاد شآد کی سوانحی

حالات اور شخصیت کو مختصراً پیش کیا گیا ہے۔

باب دوم: حیدرآبادی تہذیب کے نمایاں پہلو: اس باب میں حیدرآباد کی تہذیبی وسماجی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب سوم: اس باب میں کشن پرشاد شآد کے ناولوں کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔

باب چہارم: اس باب میں کشن پرشاد شآد کے ناولوں میں حیدرآبادی تہذیب کے نقوش کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تحقیق میں موضوع کے انتخاب کے بعد سب سے پہلی اور اہم منزل مواد کی فراہمی ہوتی ہے جس کے لئے مختلف ذرائع سے رجوع ہونا پڑتا ہے۔ بزرگوں، اساتذہ اور مختلف کتب خانوں سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔ میں نے بھی اپنی سی سعی کی ہے۔ مواد کے سلسلے میں میں نے مختلف یونیورسٹیز کی لائبریریوں کا دورہ کیا۔ ان کے نام یہ ہیں۔ لائبریری، عثمانیہ یونیورسٹی، لائبریری، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لائبریری، سالار جنگ میوزیم،، شآد لائبریری، مولانا آزاد ریسرچ سنٹر، اقبال اردو اکیڈمی لائبریری، ادارہ ادبیات اردو اور اندرگاندھی میموریل لائبریری حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی۔

نگران کار استادِ محترم محمد کاشف صاحب کی میں بے حد شکر گذار ہوں کہ انھوں نے میرے مقالے کو تکمیل تک پہنچانے میں رہنمائی کی۔ انھوں نے محنت، شفقت اور محبت سے میری رہبری و رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ اور مفید مشوروں سے نوازا۔ انہوں نے میری علمی صلاحیت کو اجاگر کرنے میں مدد کی۔ ایک اچھا استاد وہی ہوتا ہے جو شاگرد کی علمی صلاحیت کو اجاگر کرتا ہے۔

میں تہہ دل سے صدر شعبۂ اردو پروفیسر مظفر علی شہ میری صاحب کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے میرے مقالے کی تکمیل کے ہر مراحل میں مدد کی اور مختلف مشوروں سے نوازا۔ اور حوصلہ افزائی کی۔ ان کی خصوصیت یہ کہ وہ علم کا ایک ایک قطرہ شاگردوں کو بانٹتے رہتے ہیں۔ ان کی رہبری، رہنمائی، ہمت افزائی اور شفقت و محبت اس عہد میں بے مثال ہے۔ وہ ہر وقت شاگردوں کی مدد کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ شاعری میں انھیں سے اصلاح لیتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ استادِ محترم کو ترقی کے ساتھ ساتھ عمر دراز صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ آمین۔

شعبۂ اردو کے دیگر اساتذہ میں سب سے پہلے سابق صدر پروفیسر بیگ احساس (مؤظف)، پروفیسر انورالدین (مؤظف)، پروفیسر رضوانہ معین (مؤظف)، ڈاکٹر حبیب نثار، ڈاکٹر عرشیہ جبین، ڈاکٹر عبدالرب منظر، ڈاکٹر نشاط احمد، ڈاکٹر زاہدالحق اور ڈاکٹر رفعیہ سلطانہ کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے دورانِ تحقیق اپنے مشوروں سے نوازا۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے والدین کا شکریہ ادا نہ کروں۔اس سلسلے میں سب سے پہلے میری عزیز دادی جان کڑپہ فاطمہ بی بی (مرحوم) کی تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں جنھوں نے ابتدائی تعلیم سے لے کر M.Phil. تک میرا خیال رکھا۔اس کے بعد والد جناب شیخ قادر باشاہ اور والدہ شیخ امیر النساء کی ممنون و مشکور ہوں جنھوں نے میرا خاص خیال رکھا۔گھر کے دیگر افراد میں بالخصوص میری بڑی بہن زیب النساء اور بہنوئی شیخ شہنشاہ ولی کی شکرگزار ہوں کہ جن کے تعاون سے میرا یہ تعلیمی سفر نسبتاً آسان ہوگیا اور ہر مشکل گھڑی میں میرا ساتھ دیا اور میری حوصلہ افزائی کی۔اور دوسری بہن حبیب النساء اور بہنوئی شیخ عالم باشاہ کی ممنون و مشکور ہوں جن کا تعاون ہر وقت میرے ساتھ رہا اور میرے حق میں دعا کی۔

آخر میں میں مشکور و ممنون ہوں پروفیسر حبیب ضیاء، رفیع الدین قادری زور فرزند محی الدین قادری زورؔ، ڈاکٹر نارائن راج نبیر ہراجا نرسنگ راج عالی کا جنھوں نے موضوع سے متعلق مواد کے بارے میں جانکاری دی۔اور مختلف مشوروں سے نوازا۔

میں اپنے ان تمام ساتھیوں کا شکریہ ادا کرنا بھی اخلاقی فرض سمجھتی ہوں جنھوں نے تحقیق کے دوران میں میرا ساتھ دیا۔خاص طور سے میرے سینئیر اسما ناہید، (آپا)، شاہین باجی، میرے جونیر اسماء، شائستہ اور عطیہ بیگم اور واہنی بلّو، میرے ہم جماعت جبین تاج (ریسرچ اسکالر موالانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی) جنہوں نے میرے ہمت و حوصلہ کو بڑھایا۔ڈاکٹر عبدالخالق کی بھی شکرگزار ہوں کہ انھوں نے وقت پر میرا مقالہ کمپوز کیا۔ دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو صحت و تندرستی اور نیک توفیق دے۔آمین۔ثم۔آمین۔

نجم النساء نازؔ

حیدرآباد

باب اوّل:

مہاراجہ کشن پرشاد شآدسوانح اور شخصیت

خاندانی پس منظر

مہاراجہ چندولال کی دیوڑھی میں مہاراجہ نریندر بہادر کی اکلوتی صاحب زادی جوالا بی بن کی بطن سے 1864ء میں جولڑکا پیدا ہوا اسے کشن پرشاد کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ چندولال شاداں کے لاڈلے پوتے اور نریندر بہادر کے عزیز نواسے تھے۔ نجوم کے حساب سے ان کا نام پرشوتم داس رکھا گیا۔ پرشوتم داس کے نام سے انہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ ان کے نانا نریندر بہادر نے ان کو اپنے گود میں اٹھالیا اور پیار سے کشن پرشاد کے نام سے پکارا۔ مہاراجہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔

راجہ نارائن داس کے دولڑکے تھے۔ ایک مہاراجہ چندولال اور دوسرے راجہ گوبند بخش تھے۔ مہاراجہ چندولال 1766ء میں پیدا ہوئے۔ مہاراجہ چندولال اپنی ذاتی قابلیت اور ہنرمندی کے سبب بہت جلد ترقی کر گئے۔ اور ایک معمولی عہدہ سے ترقی کر کے مدارالمھامی جیسے جلیل القدر عہدہ تک پہنچ گئے۔ مہاراجہ موصوف غیر معمولی خصوصیات کے حامل تھے۔ ان کی فیاضی اور مروت کے قصے آج بھی حیدرآباد میں زبان زدخاص ہیں۔

مہاراجہ چندولال کے پوتے مہاراجہ نارائن پرشاد نریندر بہادر تھے۔ نریندر بہادر 1244ھ کے مطابق 1828ء میں پیدا ہوئے۔ ذاتی قابلیت اور ہنرمندی میں یہ اپنے آباواجداد سے کم نہ تھے۔ مختلف علوم اور مختلف زبانوں پر کامل عبور رکھتے تھے۔ نواب ناصرالدولہ نے انھیں عہدہ پیشکاری سے سرفراز کیا تھا۔

مہاراجہ کشن پرشاد کھتری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے خاندان کے بارے میں کشن پرشاد لکھتے ہیں:

> ''میرا یہ جسم سورج بنسی کھتری کے جوہر سے بنا ہے۔ کوئی ہزار چاہے کہ
> قلب ماہیت ہو جائے مگر انس نہیں بدل سکتا۔ میری رگ رگ میں

سورج بنسی کھتری کا خون دوڑ رہا ہے جیسے کہ روح تمام جسم پر محیط ہے
اور پانی انگور کے درخت میں دوڑتا ہے۔" [۱]

ولادت:

مہاراجہ کشن پرشاد 1864ء کو پیدا ہوئے۔ یہ کھتری خاندان کے تھے۔ ان کے جد امجد ان کو عزیز رکھتے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ راجا نرسنگھ راج عالی جو مہاراجہ کے قریبی دوست تھے کے مطابق 1864ء ان کی تاریخ پیدائش ہے۔ اور خود مہاراجہ نے اسی تاریخ کو مستند قرار دیا ہے۔ وہ خود "جذبات شاد" میں لکھتے ہیں:

"میری ولادت ۱۸/ شعبان المعظم سنہ ۱۲۸۰ ہجری ۲۸/ جنوری ۱۸۶۴
عیسوی کو اپنے جد مہاراجہ نریندر ہی کے گھر ہوئی تھی۔" [۲]

مہاراجہ کشن پرشاد کی والدہ کا نام جوالا بی بی اور والد کا نام راجہ ہری کشن تھا۔ راجہ ہری کشن راجہ نارائن پرشاد نریندر بہادر کے فرزند تھے۔ مہاراجہ نریندر بہادر کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ جوالا بی بی ان کی اکلوتی صاحبزادی تھیں۔ اسی لیے مہاراجہ نریندر نے کشن پرشاد ہی کو ان کا جائز وارث قرار کر دیا۔

تعلیم و تربیت:

مہاراجہ نریندر بہادر کشن پرشاد کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ مہاراجہ کی تعلیم پر انھوں نے خاص توجہ دی۔ اور ان کو مختلف علوم و فنون کو سکھانا چاہا۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ ان تمام علوم و فنون میں دستگاہ حاصل کرے جو وہ خود دستگاہ حاصل کر چکے تھے۔

مہاراجہ نریندر بہادر نے کشن پرشاد کو اپنی دلی محبتوں کی برکتوں سے قابل بنانا چاہا اور ان کی تعلیم کا انتظام بھی کیا۔ تعلیم کے بارے میں مہاراجہ کشن پرشاد لکھتے ہیں:

"۸/ رجب ۱۲۸۶ھ کو جب پانچواں سال میں قدم رکھا۔ میرے جد
امجد مہاراجہ نریندر بہادر مرحوم نے مجھے مکتب میں بٹھلایا اور استاد شفیق

میر لطف علی کو معلم مقرر فرما کر ان کے سپرد فرمایا۔۔۔ میرے جد امجد نے یہ مناسب خیال فرمایا کہ کسی اہلِ زبان سے تعلیم پاؤں۔ اس لیے کہ خود میرے جد بزرگوار نے عربی، فارسی، سنسکرت ان علوم کو اہل زبان سے حاصل فرمایا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ملک دکن کے دائرہ امراء میں جد امجد کے مقابلے کا کوئی امیر علم و فضل میں دستگاہ نہیں رکھتا تھا اور یہی سبب تھا کہ میری تعلیم کے لیے بھی انھون نے مناسب خیال فرمایا کہ جو کچھ میں سیکھوں ایسا سیکھوں کہ کوئی حرف گیری نہ کرے۔''

۳؎

اس طرح مہاراجہ کشن پرشاد نے تمام علوم میں دستگاہ حاصل کی۔ کشن پرشاد نے مختلف علوم و فنون اساتذہ سے حاصل کیئے۔ فارسی مرزا علی بابا شیرازی، عربی سید خلیل، انگریزی نرسہوان چاری، سنسکرت درگا پرشاد، سیاق مراری لال، خطاطی رائے بچولال تمکین، تیراندازی میر عظمت علی، بنوٹ مراد علی شاہ کے فرزند محمد شہاب الدین، شہسواری محمد جلال الدین اور گرمکھی کا علم گرونانک شاہ سے حاصل کیا۔

مذہب و مسلک:

مہاراجہ اپنے مذہب کے پابند تھے۔ وہ عقیدۂ ہندو مذہب کے پیرو تھے لیکن دوسرے مذاہب کا احترام کرتے تھے۔ اسلام کی بہت سی باتیں بھی ان میں پائی جاتی تھیں۔ وہ مشترکہ تہذیب کے نمونہ تھے۔ ان کے مذہب کے بارے میں نواب بہادر یار جنگ اپنے مضمون ''آں قدح بشکت وآں ساقی نہ ماند'' میں لکھتے ہیں:

''سب سے زیادہ حیرت انگیز ان کی زندگی کا مذہبی پہلو تھا۔ دسہرہ دیوالی میں ہندو پنڈت پھول اور میوے کی تھالیوں کے ساتھ آتے ان کی پیشانی پر قشقہ لگاتے اور اپنے مذہبی اشلوک پڑھ کر ان پر دم کرتے۔ اور وہ ایک سچے بھگت کی حیثیت میں نہایت احترام سے اس کو بھی قبول

کر لیتے۔ ابھی چند لمحے نہیں گزرنے پاتے کہ ان کی زبان سے قرآن
مجید کی آئتیں پھول کی طرح جھڑنے لگتیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ
مسلمان کے سواء کچھ اور ہیں۔'' [۴]

مہاراجہ کشن پرشاد ہر مذہب کا احترام کرتے تھے۔ وہ ہندو اور مسلمان دونوں سے محبت کرتے تھے۔ وہ جس مقام پر جاتے وہاں کی مختلف عبادت گاہوں پر حاضری دیتے۔ مذہبی رواداری کا ایک دلچسپ نمونہ خود ان کی خانگی زندگی تھی۔ مہاراجہ نے اپنی مختلف نظموں میں اپنے مسلک کی وضاحت کی ہے۔ پریم درپن کے دو شعر ملاحظہ ہو۔

میں ہوں ہندو میں ہوں مسلمان
ہر مذہب ہے میرا ایماں

شاد کا مذہب شادہی جانے
آزادی آزاد ہی جانے

شادی:

مہاراجہ کشن پرشاد مشترکہ تہذیب کا نمونہ تھے۔ انھوں نے سات شادیاں ہندو اور مسلم دونوں خواتین سے شادیاں کیں۔ شادی بیاہ اور دیگر رسم ورواج میں بیویوں کو اپنے مذہبی اصولوں پر عمل کرنے کی اجازت تھی۔ مسلمانوں کو اپنے مذہبی اصولوں پر چلنے کی آزادی تھی اور ہندوؤں کو اپنے مذہبی اصولوں پر۔

کشن پرشاد کے سات محلات ہیں۔ جن میں تین ہندو محلات اور چار مسلمان محلات :۔

مسلمان محلات:۔

۱۔ یٰسین بیگم (شاد محل)
۲۔ غوثیہ بیگم (مسرت محل)
۳۔ آفتاب بیگم (فرحت محل)

۴۔ رحیمہ بیگم (عشرت محل)

ہندو محلات:

۱۔ رانی دھروپتی بائی (تہنیت محل)
۲۔ رانی کشتائی بائی (مبارک محل)
۳۔ رانی رادھابائی (راحت محل)

مہاراجہ کشن پرشاد کو مسلمان بیگمات سے سات لڑکے اور بارہ لڑکیاں ہوئیں۔ اور ہندو بیگمات سے آٹھ لڑکے اور نو لڑکیاں ہوئیں۔ ان کے ہندو اور مسلم نبیرہ ابھی بھی باحیات ہیں۔ ان کے خاندان میں مشترکہ تہذیب دیکھی جاسکتی ہے۔

راجا نرسنگھ راج عاؔلی اور مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ راجا نرسنگھ راج عاؔلی اور مہاراجہ کے تعلقات اس دور سے آج تک بھی خاندان بہ خاندان قائم ہیں۔ اس بارے میں راجہ نرسنگھ راج عالی کے پوتے (نبیرہ) نارائن راج لکھتے ہیں:

> ''مہاراجہ کے خاندان سے ہمارے خاندان کے تعلقات آج بھی برقرار ہیں۔ مہاراجہ کے پوتے نواب احمد اللہ خاں صاحب (فرزند خواجہ اسداللہ خاں صاحب) اور مہاراجہ کے نواسے شیام گوپال سینچر فرزند مدن گوپال سینچر کے گھر والوں سے آج بھی یہ مراسم برقرار ہیں۔'' ۵

مہاراجہ کشن پرشاد کے خاندان کے بارے میں اور ان کے شجرہ ڈاکٹر حبیب ضیاء نے اس طرح بیان کیا ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کا شجرۂ خاندان۔ درجِ ذیل ہے۔

شجرۂ خاندان مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر

رائے مولچند

رائے لچھمی رام

رائے نارائن داس — رائے رگھن ناتھ داس — رائے بھوانی داس — رائے موہن لال — رائینا نک رام

رائے نارائن داس: راجہ گوبند بخش

رائے رگھن ناتھ داس: راجہ چندولال

راجہ چندولال: راجہ نانک بخش — راجہ بالا پرشاد

راجہ بالا پرشاد: بہبود علی خاں (فتح یاب جنگ) — راجہ نارائن پرشاد نریندر بہادر

راجہ نارائن پرشاد نریندر بہادر

جوالا بی بی (زوجہ راجہ ہری کشن)

مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ

٦

عملی زندگی:

مہاراجہ کشن پرشاد کی سرکاری زندگی میر محبوب علی خاں کے دور سے شروع ہوتی ہے۔ کشن پرشاد کو میر محبوب علی خاں نے پیشکاری عہدہ مقرر کیا۔ انھوں نے اس عہدۂ پیشکاری کو اچھی طرح سے نبھایا۔ ان کا انتظامیہ اتنا اچھا تھا کہ رعایا بہت خوش تھی۔ وہ ہندو مسلم میں فرق نہیں کرتے تھے۔ سب کو برابر سمجھتے تھے۔ انھوں نے بادشاہ وقت کی خوشنودی اطاعت اور فرماں برداری کا خاص خیال رکھا۔ آصف جاہی دور میں ان کے جد امجد نے بھی اعلیٰ عہدوں کی باگ ڈور سنبھالی۔ مہاراجہ کشن پرشاد پیشکاری کے بعد وزارت فوج، مدارالمہامی اور صدر اعظمی جیسے جلیل القدر عہدوں سے بھی سرفراز کیے گئے۔ پیشکاری کشن پرشاد کا موروثی عہدہ تھا۔ ان کے جد اعلیٰ مہاراجہ چندولال اور راجہ نریندر بہادر پیشکاری کے عہدے کے فرائض انجام دے چکے تھے۔ ان کے عہدے اور اعزازات مندرجہ ذیل ہیں۔

نمبر	دور آصف جاہی حکمران	نام اراکین	عہدہ	اعزازات
۱	نواب سکندر جاہ، نظام سوّم	مہاراجہ چندولال	پیشکار و وزیر فینانس	راجہ بہادر
۲	نواب ناصرالدولہ چوتھے نظام	مہاراجہ چندولال	مدارالمہام، دیوان	راجہ راجایان مہاراجہ بہادر
۳	نواب ناصرالدولہ	راجا نارائن پرشاد	پیشکار	راجہ راجایان نریندر بہادر
۴	نواب افضل الدولہ پانچویں نظام	راجہ نرائن پرشاد	شریک دیوان	----
۵	نواب امیر محبوب خاں نظام سادس	مہاراجہ کشن پرشاد	پیشکار و وزیر فوج	راجہ راجایان مہاراجہ بہادر
٦	نواب میر محبوب خاں	مہاراجہ کشن پرشاد	مدارالمہام (دیوان)	یمین السلطنت

۷ نواب میرعثمان علی خاں مہاراجہ کشن پرشاد صدراعظم باب ----۔
حکومت

ے

خطابات واعزازات:

مہاراجہ کشن پرشاد کومختلف خطابات واعزازات سے نوازا گیا۔ 1903ء میں ان کوحکومت برطانیہ کی طرف سے، کے۔سی۔آئی کا خطاب اور 1906ء میں مدارالمہامی کی جلیل القدر خدمات کے صلہ میں انھیں جارج پنجم کی سالگرہ کے موقع پر جی۔سی۔آئی۔ای کا خطاب دیا گیا۔ یہ 1912ء تک صدارالمہامی کے عہدے پر فائز رہے۔ملک و مالک کی وفاداری کے بارے میں مہاراجہ کشن پرشاد لکھتے ہیں:

> ''اپنے ملک و مالک کے ہمیشہ وفادار رہو۔ ہمارا خاندان شاہانِ آصفجاہی کے وابستگان قدیم میں شمار ہوتا ہےاوراسی پرہمیں فخر رہا ہے۔ ہمارے آبا واجداد اپنی وابستگی اور وارفتگی کا صلہ ہمیشہ دربارشاہی سے پاتے رہے۔ چنانچہ میرے مرحوم آقا میرمحبوب علی خاں نے میری ذات کوایک ذرہ سے آفتاب بنادیا۔ جوکچھ مرحوم نے میرے ساتھ کیا میرے موجودہ آقا میرعثمان علی خاں سلطان دکن ادام اللہ اقبال نے نہ صرف ان اعزاز کوجوان کے ناموروالد نے عطا کیا تھا۔بجائے خودقایم رکھا بلکہ ان اعزاز میں ایسی نمایاں ترقی عطا فرمائی کہ میرا ہرفن موعطائے خسروانہ کا سپاسی گذار اورعمر و دولت کی دعا دل سے نکلتی ہے۔'' ۸

سیاسی خدمات:

مہاراجہ کشن پرشاد کی سیاسی زندگی آصف جاہی دور میں بہترین ثابت ہوئی۔انھوں نے اپنی سیاسی

زندگی رعایا کی خوش حالی کے لیے گذاری۔ ملک کی سماجی، معاشی اور تعلیمی ترقی کے لیے انھوں نے ہر ممکنہ کوشش کی۔ چنانچہ ان کے عہدۂ صدارت اعظمیٰ میں ریاست حیدرآباد ایک پرامن اور خوش حال ریاست بن گئی۔ مہاراجہ کشن پرشاد نے نظم ونسق میں بہت سی اصلاحیں کیں۔ مشہور امرائے حیدرآباد میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ سیاسی زندگی میں انھوں نے چند خاص کام انجام دیئے۔ ان کی خصوصی کارگذاریاں مندرجہ ذیل ہیں:

"۱۔ جشن سیمین حضرت جلالت مآب۔

۲۔ شہزادگان والاشان کا سفر یورپ اور شادی میمنت آبادی۔

۳۔ بلدہ حیدرآباد میں سمینٹ کی سڑکیں۔

۴۔ مراکز بہبودی اطفال کا قیام۔ لڑکوں کے کھیل کود کے میدانوں کا قیام، غریبوں کے لیے حمام۔

۵۔ بحیثیت صدراعظم جملہ مستقرہائے اضلاع کا دورہ مناسب تقریریں حکام اور سربرآوردہ عہدداروں کو انعام وتحفے۔

۶۔ مجلس بلدیہ کا قیام۔

۷۔ تحت کی کارروائیوں میں عدم مداخلت۔

۸۔ باب حکومت کی مشترکہ ذمہ داریوں کا احساس اور اختلاف آرائیوں کا کم سے کم ہوجانا۔

۹۔ سررشتہ امداد باہمی سے خصوصی دلچسپی۔

۱۰۔ انفکاک ریلوے سرکارعالی، ریلوے لائنوں کی توسیع۔

۱۱۔ ریلوے بس سرویس کا قیام اور ریل سڑک اور فضائی حمل ونقل کا ارتباط۔

۱۲۔ وفاق ہند پرغوروخوص اور ایوان روساء میں شریک ہوئے بغیر اس سے اشتراک عمل کا آغاز۔

۱۳۔ برار کا نیا معاہدہ، رزیڈنسی بازار کا استرداد اور اس کا سلطان بازار سے موسوم کیا جانا۔

۱۴۔ بعض محصولات مثلاً دیاسلائی، پٹرول وغیرہ میں برطانوی ہند کے نظام میں شمولیت۔

۱۵۔ اسٹیٹ بینک کے قیام کے کارروائی کا آغاز۔

۱۶۔ گاؤں سدھار تنظیم اور سر رشتہ زراعت کی ترقی اور اس کے متعلق بعض قواعد کا نفاذ۔

۱۷۔ توسیع مجلس وضع قوانین اور حکومت مقامی خود اختیاری کی کوشش۔

۱۸۔ طبقہ امراء کی ذمہ داری حکومت سے بڑی حد تک علحیدگی اور جاگیروں پر پابندیاں اور اصول

وراثت کا رواج مثل قانون انگلستان ورثہ راست کے لیے۔

۱۹۔ عہدہ صدر الصدور کو خالی رکھنا عہدہ صنعتی عدالت العا لیہ کو گھٹا دینا۔

۲۰۔ پائیگاہوں کی وراثت کا تصفیہ اور اسٹیٹ شیوراج کے موروثی فرائض، انتظامات مال کی تخفف

اور ان مشروط الخذمت جاگیری مواضعات کا شریک خالصہ کیا جانا۔

۲۱۔ سر رشتہ تعمیرات کی عظیم ترقیاں۔

۲۲۔ ملازمت کے لیے کم از کم امتحان میٹرک کی کامیابی کا لزوم۔

۲۳۔ دستور العمل باب حکومت کی دفعہ (۳۹) کی تنسیخ جو نظمائے سر رشتہ کے مرافعوں کی سماعت

کے متعلق تھی اور جس کو علی امام نے بڑے شدومد سے شامل دستور کیا تھا۔

۲۴۔ توشک خانہ عامرہ اور خیرات ومبرات کا تعلق پیشی خسروی کے بجائے فینانس سے ہو جانا۔

اس کے خدمات متعلقہ میں تخفیف اور عدم وراثت کا تصفیہ۔

۲۵۔ عثمان آباد کے دو نظمائے عدالت کی برطرفی اس بناء پر کہ شریک ناظم کی بیوی نے اپنی ملازمہ کو ایسی سزا دی کہ وہ مر گئی۔

۲۶۔ بعض اعلیٰ عہدہ داران سر کار عالی کی برطرفی باوظیفہ پر علیٰحدگی۔

۲۷۔ گردوارہ ناندیڑ کی اراضی سے متصف ایک مسلمان کی تدفین سکھوں کی ناراضی، تحقیقات

اور بالآخر مدفونہ نعش کی منتقلی کا حکم۔

۲۸۔ سرکاری فوج کی تنظیم اوراس کے لیے دوانگریز افسروں کا تقرر

۲۹۔ غیرفوجی طیارہ رانی کا آغاز۔

۳۰۔ مستقرہائے اضلاع میں آب رسانی کا انتظام۔

۳۱۔ چنگی وکروڑ گیری کے محصولات میں تغیرات وجدیدانتظامات۔

۳۲۔ دفتر دیوانی وسال یعنی مرکزی محافظ خانہ سرکار عالی کی تہذیب وترقی کے لیے وسیع اسکیم۔

۳۳۔ گزیٹیڈ ملازمتوں کی ماہوار اور تعداد میں اضافہ۔

۳۴۔ بڑے منصوبوں کوفروخت کر کے یکشمت معاوضہ حاصل کرنا۔

۳۵۔ وظیفہ یاب ملازموں کی بیواؤں اور پسماندگوں کے لیے بھی وظیفہ کے قاعدے کا نفاذ۔

۳۶۔ تعین مراتب میں عظیم تغیرات اور برطانوی رزیڈنٹ کا شہزادگان والاشان اورارکان خانوادہ شاہی پرتفوق۔

۳۷۔ باب حکومت کی رکنیت اور بعض دیگر اعلیٰ خدمات سلطنت پر انگریزوں کی ماموری کا تصفیہ۔

۳۸۔ سرکار عالی کے سول سررشتوں کی ترقی ''۹

آصف جاہی دور میں صدر اعظم کے عہدے پر کشن پرشاد میر محبوب علی خاں کے دور میں گیارہ سال تک اوران کے بعد میر عثمان علی خاں کے دور میں گیارہ سال تک یعنی بائیس سال تک کشن پرشاد صدر اعظم کے عہدہ پر فائز رہے۔ انھوں نے ان عہدوں کے فرائض کو بخوبی انجام دیا۔ رعایا خوش حال تھی۔ وہ 1912ء تک صدرالمہام کے عہدہ پر فائز رہے اس کے بعد مہاراجہ نے استعفیٰ دے دیا اور سیاسی مصروفیتوں سے سبکدوش ہوکر علمی مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ اس زمانہ میں انھوں نے مختلف مقامات کا سفر کیا اور وہاں کے حالات اور دیگر تفصیلات کو روز نامچہ کی صورت میں محفوظ کرتے گئے۔ شعروسخن کی باقاعدہ محفلیں منعقد کرنے لگے جن میں نامور شعراء شریک ہوتے اور اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ علمی اورادبی مشاغل کے علاوہ

مہاراجہ نے اپنے فرصت کے اوقات دوسرے مشاغل جیسے پینٹنگ وغیرہ میں بھی صرف کرتے تھے۔

علمی وادبی خدمات:

مہاراجہ کشن پرشاد کو کم عمر ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ چنانچہ انھوں نے ابتداء میں بچّو لال تمکین سے اشعار کی اصلاح لینی شروع کی۔ بچّو لال تمکین کے انتقال کے بعد میر عبدالعلی والؔہ اور محمد مظفرالدین معلیٰ سے مشورہ لیتے تھے۔ اسی زمانے میں داؔغ کی شاعری کی شہرت ہوئی۔ غفران مکان نواب میر محبوب علی نے انھیں اپنی استاذی کی عزت بخشی تو کشن پرشاد نے بھی انھیں سے اصلاح لینی شروع کی ایک موقع پر کشن پرشاد نے اپنی ایک غزل اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کی۔ اعلیٰ حضرت نے حسب ضرورت اس میں اصلاح کی۔ اس کے بعد سے کشن پرشاد ''تلمیذ آصف'' کہلائے جانے لگے۔ وہ فارسی، اردو اور ہندی میں بڑی روانی سے شعر کہتے تھے۔ وہ فارسی میں علامہ شوستری، نواب یار جنگ، مولانا عمادی و مولوی مسعود صاحب محوی اور تر کی صاحب سے مشورہ فرماتے تھے۔

کشن پرشاد نام اور تخلص شاؔد تھا۔ انھوں نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی، مرثیہ، مناجات، نظم، نثر، قطعات، رسالے، سفرنامے، روزنامچے، خطوط وغیرہ۔ یہ صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ علمی، مذہبی اور اصلاحی موضوعات پر مختلف مقالے لکھے پانچ عمدہ ناول بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی تصنیف وتالیف کی ابتداء ''لطائف بے نظیر'' اور ''باغ و بہار عجیب'' سے کی۔ بچپن سے لے کر عمر کے آخری عرصہ تک ان کا سلسلۂ تصنیف وتالیف جاری رہا۔ اس مدت میں انھوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ اور غزلوں کے کئی مجموعے چھپ کر منظر عام پر آئے۔ ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

ان کی نظموں کے مجموعے مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ رین بسیرا ۱۳۴۳ھ 1925ء

۲۔ مجموعہ مناجات

۳۔ نظم دوپیسہ ۱۳۴۳ھ 1925ء

۴۔	نعرۂ مستانہ	۱۳۴۰ھ	1922ء
۵۔	درسِ محبت		
۶۔	جذبۂ قومی		

فارسی نظمیں:

۱۔ آئینۂ عقیدت

۲۔ پیمانۂ عقیدت

۳۔ ایمان شاد

غزلوں کے مجموعے:

۱۔	بابِ شاد	۱۳۰۸ھ	1890ء
۲۔	خمکدۂ شاد	۱۳۲۵ھ	1907ء
۳۔	نغمۂ شاد	۱۳۲۵ھ	1907ء
۴۔	بیاض شاد	۱۳۴۲ھ	1924ء

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کے قصیدے مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔	باغ شاد	۱۳۰۸ھ	1890ء
۲۔	گلبن تاریخ	۱۳۱۳ھ	1895ء
۳۔	ارمغان زیبا	۱۳۱۲ھ	1894ء
۴۔	نسیم سحر	۱۳۱۶ھ	1898ء
۵۔	خمکدۂ رحمت	-	
۶۔	سیر وسفر		
۷۔	آئینۂ عقیدت	۔	۔

۸۔	سالنامہ رہبر ودکن	۔	
۹۔	رہبر دکن سالگرہ	۔	۔
۱۰۔	روز نامہ صبح دکن	۔	۔

مثنویاں:

۱۔	عرضِ حال	۱۳۴۰ھ	1961ء
۲۔	پریم درپن	۱۳۴۵ھ	1927ء
۳۔	جلوۂ کرشن	۔	۔
۴۔	خمار شاد	۔	۔
۵۔	بزم توحید	۔	۔
۶۔	کرشن کلا	"	"
۷۔	مثنوی آئینہ وحدت	۱۳۳۷ھ	1919ء
۸۔	مثنوی آئینہ وجود	۱۳۳۸ھ	1920ء
۹۔	مثنوی سر وجود	۱۳۳۸ھ	1920ء
۱۰۔	مثنوی خمار شاد	۱۳۴۱ھ	1923ء
۱۱۔	ماتم حسین منظوم	۱۳۳۶ھ	1918ء
۱۲۔	مثنوی مناجات	۱۳۴۰ھ	1922ء

مسدس:

۱۔	آشوب عظیم	۱۳۳۸ھ	1920ء

مرثیے:

۱۔ ماتم حسین

۲۔ نوحۂ شاد

۳۔ نوحۂ شمش الملک 1907ء

۴۔ نوحۂ آصف پرشاد

رباعیات وقطعات:

۱۔	صبح امید	۱۳۱۷ھ	1899ء
۲۔	شگوفتۂ بہار	۱۳۲۷ھ	1909ء
۳۔	نذر سلطان	۱۳۲۹ھ	1911ء
۴۔	رباعیات شاد	۱۳۳۳ھ	1915ء
۵۔	نذر شاد	"	"

ہندی شاعری:

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد نے ہندی زبان میں بھی بکثرت ٹھمریاں، کافیاں، بھجن، خیال اور بارہ ماسے مختلف دھنوں میں لکھے ہیں۔ ان کے ہندی کلام کے دو مجموعے ''نغمۂ شاد'' اور ''ترانۂ شاد'' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کے نثری مقالات:

۱۔	دسہرا		
۲۔	ہندو بھائیوں سے خطاب	۱۳۴۸ھ	1938ء
۳۔	معراج ترقی		
۴۔	کرشن کلا		
۵۔	فریاد شاد	۱۳۲۹ھ	1911ء
۶۔	آزادی	۱۳۲۳ھ	1905ء

۷۔ سوریہ پرکاش

۸۔ گیان درپن

۹۔ دین حسین

۱۰۔ نورچشم ۱۳۳۸ھ 1920ء

۱۱۔ موتیوں کی لڑی

۱۲۔ ارض الرمل

۱۳۔ ارمغان وزارت ۱۳۲۴ھ 1906ء

۱۴۔ پریم بچن

۱۵۔ قومی لیڈر ۱۳۳۶ھ 1918ء

۱۶۔ قربانی ۱۳۴۵ھ 1927ء

۱۷۔ نذر عقیدت

۱۸۔ رن بیر ۱۳۴۰ھ 1921ء

شاؔد کے مضامین مندرجہ ذیل ہیں

۱۔ معرفت نفس 1907ء

۲۔ دولت کیا چیز ہے۔ ۔

۳۔ ماضی وحال 1928ء

۴۔ تقسیم رگ وید ۔

۵۔ سالگرہ مبارک 1904ء

۶۔ ہولی 1909ء

۷۔ صاحب قرآن 1898ء

۸۔ نہ ہر زن زن است نہ ہر مرد مرد 1915ء

۹۔ انتقال پُر ملال مہاراجہ نریندر بہادر — 1889ء

۱۰۔ کامیابی — 1929ء

۱۱۔ سری رام چندر جی کی فطرت کا
مطالعہ ایک شجاع کی نظر سے — 1933ء

۱۲۔ عرب کا گھوڑا

۱۳۔ گرو گوبند سنگھ اور ہم

متفرقات:

۱۔ لطائف بے نظیر

۲۔ ضلع جگت — ۱۳۲۳ھ — 1905ء

۳۔ مخزن القوافی — ۱۳۲۶ھ — 1918ء

ناول:

۱۔ سرمایۂ سعادت — ۱۳۰۵ھ — 1887ء

۲۔ مطلع خورشید — ۱۳۱۵ھ — 1897ء

۳۔ پیچل نار — ۱۳۲۱ھ — 1903ء

۴۔ بزم خیال (یہ تین حصوں پر مشتمل ہے) ۱۳۲۷ھ — 1909ء

۵۔ فسانۂ شیدا — – — –

سفرنامے:

۱۔ جذبات شاد — ۱۳۲۸ھ — 1910ء

۲۔ جام جہاں نما

۳۔ سیر ناگپور — ۱۳۲۷ھ — 1909ء

۴۔	سیر وسفر	۱۳۲۶ھ	1908ء
۵۔	روزنامچہ گلبرگہ	۱۳۴۱ھ	1923ء
۶۔	سفر شاد نگر	۱۳۴۱ھ	1923ء
۷۔	تفریح شاد	۱۳۴۳ھ	1925ء
۸۔	روضۂ شریف		
۹۔	سفر دو ہفتہ	۱۳۲۰ھ	1902ء
۱۰۔	شگار شیر شاہی	۔	۔
۱۱۔	سیر پنجاب	۱۳۴۱ھ	1923ء
۱۲۔	قدوم سلطانی	۱۳۱۶ھ	1898ء
۱۳۔	ایک سفر نامہ	۔	۔
۱۴۔	وظائف الشاد	۱۳۴۳ھ	1925ء
۱۵۔	ناوک غم	۱۳۴۳ھ	1925ء

مہاراجہ کشن پرشاد شآد کی سر پرستی میں نکلنے والے رسائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔	دبدبہ آصفی	1897ءتا1899
۲۔	شوکت عثمانی	1900ء
۳۔	محبوب الکلام	1897ءتا1899ء
۴۔	تزک عثمانیہ	1906ء
۵۔	گلدستہ دار السلطنت	
۶۔	گلدستہ جشن آصفیہ	
۷۔	حیاتِ سخن	1930ء[10]

مہاراجہ کشن پرشاد شآد نے مختلف خطوط مشہور ادیبوں کو لکھے ہیں۔ان کے خطوط کے مجموعے مندرجہ

ذیل نام سے شائع ہوئے ہیں:

۱۔ رقعاتِ شاد

۲۔ جمال یار

۳۔ شاد اقبال

۴۔ اکبر الہ ا بادی اور شاد

۵۔ مکاتیب یمین السلطنت

ان کے علاوہ مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد نے جو مختلف اہل قلم حضرات کو خط لکھے ہیں۔ ان میں بعضمطبوعہ ہیں اور بعض غیر مطبوعہ خطوط ہیں۔ پروفیسر حبیب ضیاء کو مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے جو غیر مطبوعہ خطوط دستیاب ہوئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ نظم طباطبائی

۲۔ جوش ملیح آبادی

۳۔ عبدالماجد دریابادی

۴۔ نیاز فتح پوری

۵۔ نصیر حسین خاں خیال

۶۔ نواب عماد الملک

۷۔ حکیم القمان الدولہ

۸۔ عبدالجبار خاں آصفی

۹۔ غلام مصطفی رساؔ

۱۰۔ انوار اللہ خاں

۱۱۔ کاظم علی باغؔ

مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ کے خطبات وتحریکات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ تحریکات

۲۔ ضمیمۂ تحریکات

۳۔ خطبہ صدارت

۴۔ خطبۂ جامعہ عثمانیہ

۵۔ سپاس نامہ جات وجوابات ودیگر تقریرات

۶۔ اسپیچ محبوب گنج

مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ کی تمہیدات وتقریظات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ دیباچہ مثنوی راسخ

۲۔ تمہید دیوان حسن سنجری

۳۔ دیباچہ سفینہ شیخ علی حزیںؔ

۴۔ تقریظ دیوان قمرؔ

مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ کے تعلقات جن ادیبوں اور شاعروں سے تھے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ امیر مینائی

۲۔ رتن ناتھ سرشار

۳۔ داغ دہلوی

۴۔ سید علی بلگرامی

۵۔ حالؔی

۶۔ شبلؔی

۱۹۔ خواجہ حسن نظامی

۲۰۔ پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی

۲۱۔ ظفر علی خاں

۲۲۔ مولوی عبدالحق

۲۳۔ ہوش بلگرامی

۲۴۔ نرسنگھ راج عالی

۷۔ اکبرالہ آبادی

۸۔ عبدالحلیم شرر

۹۔ عابد مرزا بیگم

۱۰۔ نظم طباطبائی

۱۱۔ ریاض خیرآبادی

۱۲۔ نصیر حسین خاں خیالؔ

۱۳۔ علامہ اقبال

۱۴۔ فانیؔ

۱۵۔ فصاحت جنگ جلیل

۱۶۔ مرزا فرحت اللہ بیگ

۱۷۔ سر شیخ عبدالقادر

۱۸۔ سید سلیمان ندوی [۱۱]

۲۵۔ عمادالملک

۲۶۔ تاجور نجیب آبادی

۲۷۔ آغا شاعر قزلباش

۲۸۔ اختر مینائی

۲۹۔ عزیز یار جنگ

۳۰۔ ترک علی شاہ ترکیؔ

۳۱۔ عبدالجبار خاں آصفی

۳۲۔ عبدالماجد دریابادی

۳۳۔ ماہرالقادری

۳۴۔ نیاز فتح پوری

۳۵۔ جوش ملیح آبادی

اس کے علاوہ مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ کے ہاں درباری مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ جن میں مشہور ادیب اور شاعر حصہ لیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر حبیب ضیا مہاراجہ شادؔ کے دربار میں منعقد مشاعرہ کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''مہاراجہ شادؔ کے جد اعلیٰ مہاراجہ چندولال شاداںؔ اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ ان کی دیوڑھی میں اکثر شعر وسخن کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔ جن میں نامور شعرا حصہ لیتے تھے۔ کئی شعراء کو مہاراجہ کی سرپرستی حاصل تھی۔ چندولال شاداںؔ کی طرح مہاراجہ شادؔ کی طبیعت بھی ابتدا ہی سے شعر وسخن کی طرف مائل تھی۔ وہ خود شعر کہتے تھے اور دوسروں کو شعر کہنے کی ترغیب دیتے تھے۔ ان کے یہاں بھی مختلف اوقات میں مختلف صحبتوں میں شعر وسخن کی

محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں متعدد شعرا حصہ لیا کرتے تھے۔‘‘

۱۲

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کو شعر وسخن سے طبعی لگاؤ تھا۔ اپنے طبعی لگاؤ کی وجہ سے مشق سخن شروع کی اور مختلف اساتذہ سے اصلاح لینی شروع کی۔ رفتہ رفتہ ان کی طبیعت کے جوہر نکھرنے لگے اور وہ ہر صنف سخن میں اپنا کمال دکھانے لگے۔ وہ بڑے پُر گو اور زود گو شاعر تھے۔ ان کو اردو ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ڈاکٹر حبیب نثار مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی تعلیمی دلچسپی کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’مہاراجہ شاؔد کو متاع لوح وقلم ورثے میں ملا تھا۔ انھیں نہ تو خونِ دل میں انگلیاں ڈبونے کی آزمائش سے گزرنا پڑا اور نہ اردو شعر و شاعری کے آئینہ میں انھیں اپنا چہرہ اجنبی دکھائی دیا۔ انھوں نے جب آنکھیں کھولیں، شعور سنبھالا تو دیکھا کہ ان کا ماحول اردو تہذیب کا رہینِ منت ہے۔ ان کا رہن سہن اردو مزاج کا حامل ہے۔ اور مہاراجہ شاؔد اسی ماحول میں رنگتے چلے گئے اور اپنی عمر عزیز اردو ادب اور ادیبوں کے درمیان گزار دی۔‘‘ ۱۳

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کے چند اشعار جو مجھے بے حد پسند ہیں ملاحظہ فرمایئے:

جو کرتا ہے محنت وہ پاتا ہے راحت
جو پیسے ہے آٹا وہی چھانتا ہے

زوال اس کو کبھی ہوتا نہیں ہے
اٹھے جو یاد میں اس کی سحر ہے

اگر شہرت کی خواہش ہے ہنر کیجئے تو حاصل ہو
ثمر کے واسطے پیدا شجر کیجئے تو حاصل ہو
محبت ظاہری باتوں سے گر کیجئے تو نہیں ہوتی
اگر دل میں کسی کے آپ گھر کیجئے تو حاصل ہو
تجھے یہ بات کہتا ہوں سمجھ اور بوجھ اے شاداں
مشقت اس کے ملنے میں اگر کیجئے تو حاصل ہو

علمی مشاغل:

مہاراجہ کشن پرشاد شآد کو علمی مشاغل سے خاص دلچسپی تھی۔ یہ اپنے ہم عصر امراء میں نمایاں خصوصیت رکھتے تھے۔ وہ اپنے فرصت کے اوقات کو علمی مشاغل اور علمی تذکروں میں گزارتے تھے۔ وہ بعض انمول مقولے اور مضامین اور تالیفات، اشعار اپنے ذاتی مصارف سے شائع کیا کرتے تھے۔ اور چند تالیفات کو خوش خط لکھا کر وہ ایسی جگہ رکھتے تھے کہ لوگوں کی اس پر نظر پڑھتی رہے تا کہ تربیت بھی حاصل ہو اور علم بھی بڑھے یہ مقولے اپنی ادبی تاریخی اور عرفانی واقفیت و مشاغل کے لحاظ سے خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ یہ مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔	خدا	:	شانتی کا سمندر ہے۔
۲۔	خودی	:	سے خدا کا پتہ ملتا ہے۔
۳۔	عشق	:	آگ ہے غیر حق کو جلانے والی۔
۴۔	خدا کی طلب	:	مستغنی کرتی ہے۔
۵۔	انانیت حقیقی	:	بیخودی کا پیمانہ ہے۔
۶۔	محبت	:	عشق کی چنگاری ہے۔
۷۔	بے خودی	:	خواب شیرین ہے۔
۸۔	عبودیت	:	معراج حقیقی کا زمانہ ہے۔

۹۔	عاشق	:	پروانہ ہے حسن کا۔
۱۰۔	تبسّم	:	غنچہ نیم باز ہے۔
۱۱۔	ہنسی	:	برق کی تصویر ہے۔
۱۲۔	غم	:	ابتداء ہے خوشی کا۔
۱۳۔	غصّہ	:	شمشیر برہنہ ہے۔
۱۴۔	موت	:	بے خودی کا سمندر ہے۔
۱۵۔	خوشی	:	پیش خیمہ ہے غم کا۔
۱۶۔	حیات	:	موت کا پیغامبر ہے۔
۱۷۔	دل	:	امانت الٰہی ہے۔
۱۸۔	تعصب	:	رہزن ایمان ہے۔
۱۹۔	ریاست	:	غرور کا خزانہ ہے۔
۲۰۔	حکومت	:	تکبر کا تاج ہے۔
۲۱۔	دولت	:	مشکل کشا ہے۔
۲۲۔	سخاوت	:	کیمیا ہے دین اور دنیا کی
۲۳۔	بخل	:	چور ہے عزت وایمان کا۔
۲۴۔	حلال کی روزی	:	مال غنیمت ہے۔
۲۵۔	جھوٹ کہنا	:	بے اعتباری کا غم بونا ہے۔
۲۶۔	تہہ دستی	:	بھیک کا ٹھیکرا ہے۔
۲۷۔	بچپن کی موت	:	پہلی منزل کا مسافر۔
۲۸۔	شاعر	:	تخیلات کا پُتلا ہے۔
۲۹۔	شاعری	:	جذبات کا خزانہ ہے۔
۳۰۔	شعر	:	جذبات کی اولاد ہے۔

۳۱۔ جوانی کی موت : حسرت بھری نیند ہے۔

۳۲۔ حسد : درندہ ہے۔

۳۳۔ حرص : دام ہے جو ہوا پر بچھا ہوا ہے۔

۳۴۔ آرزو : امیدوار ہے۔

۳۵۔ ایمان : مشعل طریقت و شریعت۔

۳۶۔ پیغمبر : کلیدی عقل کا ہے۔ [۱۴]

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کو تعمیرات کا شوق تھا۔ اس کے علاوہ ان کو نادر اشیاء جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ ان کے شوق کی چیزوں میں ہتھیار، قیمتی لباس، فرش، فرنیچر، جواہرات، شیر شکاری، فوٹو، مونوگرام، کرسمس کارڈز، فونٹین پن جیسی گھڑیاں، تیر اندازی، عطر سازی، ٹینس، طباخی وغیرہ ہیں۔

نرسنگھ راج عالؔی اپنے ایک مضمون ''حضرت شاد اب کہاں عالؔی'' میں مہاراجہ کے مشاغل کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آپ حکیم تھے۔ حکمت سیکھی تھی۔ یہ زمانہ پیشکاری مطب فرمایا کرتے تھے۔ آپ علم رمل اور جوتش کے ماہر تھے۔ اکثر صحیح احکام لگاتے تھے۔ ۔۔۔آپ سپاہیانہ جوہر سے متصف تھے۔ شکار اچھا کرتے تھے۔ تلوار، بنوٹ وغیرہ کے ماہر تھے۔ آپ کو فن مصوری، نقاسی، عطر سازی میں کمال تھا۔ فتنۂ شاد آپ ہی کی ایجاد ہے۔ آپ کو موسیقی میں اچھا دخل تھا۔ ستار، ہارمونیم وغیرہ آپ کے خاص مذاق کی چیز تھی۔ آپ کھانے اور کھلانے کے بڑے شایق تھے۔ اکثر دفعہ آپ نے مجھے اور اپنے دیگر دوستوں کو بعض نایاب کھانے پکا کر کھلایے ہیں۔'' [۱۵]

اس کے علاوہ مہاراجہ نے ان علوم و فنون کی بھی تعلیم حاصل کی۔ خطاطی، تیر اندازی، بنوٹ، شہواری، علم تصوف و حقائق، علم نجوم، علم رمل، پینٹنگ وغیرہ وغیرہ۔

شخصیت:

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کی سیرت کا سب سے نمایاں اور واضح پہلوان کی مروت، ہمدردی اور سخاوت ہے۔ سخاوت انھیں مہاراجہ چندولال سے ورثے میں ملی تھی۔ یہی وہ خصوصیت تھی جس سے مہاراجہ ہر دل عزیز تھے۔ وہ کسی کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا مذہب انسانیت اور پریم ان کا مسلک تھا۔ مہدی نواز جنگ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''مہاراجہ کی مخفی خیرات کی یہ حالت تھی کہ ان کے دین کا کسی کو علم نہ ہوسکتا تھا۔ کسی کو وہ کچھ دیتے تو اس کا خیال رکھتے کہ دوسرے کو علم نہ ہو۔ اکثر خود ہی اپنے ہاتھ سے دیا کرتے تھے اور دیتے وقت ان کی آنکھ نیچے ہوتی تھی۔ کبھی یہ بھی دیکھا ہے کہ اگر سائل شریفِ الخاندان ہوتو مہاراجہ آبدیدہ ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ وہ بمبئی سے حیدرآباد کے لیے روانہ ہونے کو تھے اور ان کی جیب خاص میں صرف گیارہ سو کلدار رہے تھے۔ مشرق قریبہ کے ایک عزیز الوطن شہزادہ نے مہاراجہ سے ملاقات کی اور اپنی مالی مشکلات کا ذکر کیا۔ مہاراجہ کے پاس جو کچھ تھا یعنی گیارہ سو کلدار لفافہ میں بند کر کے ان کے حوالے کر دیئے اور خود خالی ہاتھ ہوگئے۔''۱۶

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کو بچوں سے خاص محبت تھی۔ کوئی چھوٹا بچہ ان کے قریب سے گزرتا تو اسے شفقت کرتے۔ وہ امیروں اور غریبوں کے بچوں میں فرق نہیں کرتے تھے۔ غریبوں کے میلے کچیلے بچوں کو اپنی گود میں لینا اور ان کو پیار کرنا مہاراجہ کی معمولی عادتوں میں داخل تھا۔ مہدی نواز جنگ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ قصّہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مہاراجہ مرحوم بنگلور سے حیدرآباد آرہے تھے راستہ میں ایک غریب عورت کا بچہ ریل سے گر پڑا۔ ریل کی رفتار تیز نہ تھی۔ پھر بھی بچہ بری

طرح زخمی ہوا۔ ریل رُکی۔ رکنے کی وجہ معلوم ہوئی تو مہاراجہ باوصف
کیرنسی ریل سے فوراً اتر پڑے۔ بچے کے پاس پہونچے۔ بے قرار ماں
کو تسلی دی۔ بچہ کو خود اٹھالیا اور اپنے سیلون میں لے آئے۔ بچہ کے خُون
سے مہاراجہ کے کپڑے رنگین ہوگئے تھے۔ اسٹاف ڈاکٹر کو طلب کیا۔
بچہ کو مرہم پٹّی کرائی اور دوسرے اسٹیشن پر بچہ کی ماں کو انعام واکرام
دے کر بچے کے ساتھ رخصت کیا۔'' ١٧

صحیح معنوں میں مہاراجہ کشن پرشاد شآد ایک عوامی وزیر اعظم تھے۔ ان کی بارگاہ بلا امتیاز مذہب و ملت و پیشہ وطبقہ تمام انسانوں کے لیے کھلی ہوئی تھی۔ ہر شخص بے روک وٹوک ان سے مل سکتا تھا۔ وہ اپنے نانا چندولال کی طرح سب لوگوں کی مدد کرتے اور ان کو اتنا دینے کے بعد ہی خوش ہوتے تھے کہ خود کے پاس کچھ نہ رہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد شآد نے ادبی ماحول میں پرورش پائی۔ ان کو میر محبوب علی اور میر عثمان علی خاں کی شفقت حاصل تھی۔ کشن پرشاد شآد کے بارے میں ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ لکھتے ہیں:

''کشن پرشاد 1901ء میں وقارالامراء جیسے شائستہ و باوقار اور مربّی
فصل وکمال وزیر اعظم کے جانشین ہوئے تھے اور اس وقت حیدرآباد کی
سیاسی، علمی، ادبی اور تمدنی زندگی اتنے اعلیٰ معیار پر پہونچ چکی تھی کہ اس
کو جاری رکھنے یا اس میں اضافہ کرنے کے لیے ایک غیر معمولی شخصیت
کی ضرورت تھی۔ حسن اتفاق سے کشن پرشاد کی ذات میں بعض ایسی
غیر معمولی باتیں جمع ہوگئی تھیں جو ان کے پیشرو وزرائے اعظم میں
موجود نہ تھے۔۔۔۔۔ وہ صحیح معنوں میں ایک عوامی وزیر اعظم تھے۔''
١٨

مہاراجہ کشن پرشاد شآد نے بہت سی خدمات انجام دیں۔ انھیں خدمات کو دیکھ کر نواب بہادر یار جنگ نے ایک تقریبی جلسے میں فرمایا تھا۔

''دے کر اترا نے والے تو بہت دیکھے
دے کر شرمانے والا پہلے ایک نظر آیا''

۱۹

اس بات کو سکندر علی وجدؔ نے یوں کہا ہے:

''یہ تیری حُسن عطا دل کو بہت بھاتا ہے
کر کے سائل پہ کرم آپ ہی شرما جاتا ہے''

۲۰

اکثر شعراء شمالی ہند سے دکن آئے اور مہاراجہ کے دربار میں رہ گئے۔ یہاں تک کہ پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ کشن پرشاد شادؔ کے ہی ہو کے رہ گئے تھے۔ مہاراجہ شادؔ ان سے بہت عنایت کرتے تھے۔ آخری دم تک سرشارؔ بھی ان سے جدا نہ ہوئے۔ سرشارؔ کا انتقال 1926ء میں حیدرآباد ہی میں ہوا۔ ان کے انتقال سے کشن پرشاد شادؔ بہت ٹوٹ چکے تھے۔ ان کو بہت صدمہ ہوا تھا جسے وہ برداشت نہیں کر پائے تھے۔

جب مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ نے 77 سال کی عمر میں 1940ء میں داعی اجل کو لبیک کہا تو فرمان روائے وقت نے کہا:

''جو خوش قسمت ہستیاں ہوتی ہیں وہ ضرور حاصلِ صفات نیک ہوتی ہیں کہ دنیا میں رہنے تک عزت و آبرو کی زندگی بسر کرتی ہیں تو اپنے اعمالِ حسنہ چھوڑ جاتی ہیں۔ ایسے افراد کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہی کم ہے۔'' ۲۱

مہاراجہ مجسمۂ وضع داری تھے تبھی تو ماہر القادری نے کہا تھا:

''محفل ہستی سے تو کیا اٹھ گیا، وضع داری کا جنازہ اٹھ گیا'' ۲۲

حیدرآباد میں اردو کا سن ۱۳۰۱ھ مطابق 1884ء میں سرکاری زبان قرار پانا ادارہ تالیف و ترجمہ کی تاسیس، مدارس میں اردو ذریعہ تعلیم، جامعہ عثمانیہ کا قیام جیسے عظیم الشان کارنامے نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس اور نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کی اردو نوازی کا نتیجہ تھا۔ ان کے ساتھ مہاراجہ

کشن پرشاد نے بھی اردو زبان وادب کی خدمت کی۔اردو زبان کو بلندی عطا کی اور ریاست میں اس زبان سے محبت کرنے کی فضاء پیدا کردی۔مہاراجہ کشن پرشاد نے اردو کو سرکاری زبان بنانے میں اور جامعہ عثمانیہ کے قیام میں مدد کی۔وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے پہلے Vice-Chanclor تھے۔ان کو اردو ادب سے خاص لگاؤ تھا۔حیدرآباد میں اردو کو سربلند کرنے میں جو عوامل کارفرما رہے ان میں سب سے زیادہ طاقتور عامل مہاراجہ کشن پرشاد کی اردو دوست اور ادب نواز شخصیت تھی۔

مہاراجہ کشن پرشاد شآؔد کی صفات کے بارے میں محمد رحیم الدین انصاری لکھتے ہیں:

''میر عثمان خان والی سلطنت آصفیہ ہی کی طرح ہزا کسلسنی مہاراجہ کشن پرشاد بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی دو آنکھیں متصور کرتے تھے۔۔۔ وہ درویش نواز ہی نہیں بلکہ درویش صفت آدمی بھی تھے۔رواداری و بے تعلقی جس قدر شآؔد میں دیکھی گئی ارباب اقتدار میں شاید ہی کہیں دیکھی گئی ہو۔جو بھی ان سے ایک بار ملتا بار بار ملنے کی تمنا کرتا۔وہ خوبیوں کا منبع اور کمالات کا مرجع ہونے کے باوصف صبر وشکیبائی کا پیکر اور عجز و نیاز کا مرقع تھے۔'' ۲۳

مہاراجہ کشن پرشاد شآؔد ایک اچھے ذمہ دار انسان تھے۔وہ مصنف، پرگو شاعر اور نثر نگار بھی تھے۔اس کے علاوہ وہ ایک اچھے سخی دل بھی تھے۔کسی کا دُکھ ان سے دیکھا نہیں جاتا۔وہ جس کسی کو بھی دُکھی دیکھتے تو ان کے آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ان کو اردو ادب سے خاص لگاؤ تھا۔انھوں نے اردو ادب کے لیے بہت سی خدمات انجام دیں۔سیاسی اعتبار سے وہ ایک مثالی وزیر اعظم بنے۔اور سماج کی فلاح و بہبودی کے لیے متعدد کارنامے انجام دیئے۔سیاسی حیثیت سے انھوں نے اپنے عہدوں اور ذمہ داریوں کو اچھی طرح نبھایا ہے۔وہ ہندو اور مسلم میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔دوستوں کے غم گسار وملنسار تھے۔امیر غریب ہر کوئی ان سے بلا جھجک مل سکتا تھا۔وہ علماء کے ہمدرد بھی تھے اور سرپرست بھی۔وہ مشترکہ تہذیب کے نمونہ تھے۔وہ رعایا کے غم خوار اور شاہ کے وفادار تھے۔انھوں نے بہت سی علمی، سیاسی وسماجی خدمات کو انجام دیا۔ان کے جیسا سخی دریا دل، وضع دار انسان آج کے دور میں ملنا بہت مشکل ہے۔یہ وضع داری اور وفاداری کا نمونہ تھے۔

انھوں نے جتنی خدمات انجام دیں یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اجتماعی حیثیت سے وہ قدیم تہذیب کا نمونہ تھے۔

حوالے:

۱۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد حیات اور ادبی خدمات ڈاکٹر حبیب ضیاء، 1978 ص:15

۲۔ ایضاً،۔۔۔۔۔۔۔۔ ص:22

۳۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی زندگی کے حالات، مہدی نواز جنگ، 1900 ص: 73-74

۴۔ مجلّہ عثمانیہ، مہاراجہ نمبر، ص:47

۵۔ گلدستۂ شادؔ، مرتب پروفیسر حبیب ضیاء، زیر نگرانی محمد رحیم الدین انصاری، 2009ء ص:30

۶۔ کشن پرشاد شاد حیات اور ادبی خدمات، ڈاکٹر حبیب ضیاء، 1978ء، ص:20

۷۔ نذر شاد، مرتبین ڈاکٹر نارائن راج، پروفیسر حبیب ضیاء، 2009ء ص:

۸۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی زندگی کے حالات، مہدی نواز جنگ، 1900ء ص:30

۹۔ ایضاً۔ ص:192-193

۱۰۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد حیات اور ادبی خدمات، ڈاکٹر حبیب ضیاء، ص:215-216

۱۱۔ ایضاً " " ص:219

۱۲۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد حیات اور ادبی خدمات، ڈاکٹر حبیب ضیاء، 1978ء، ص:39-40

۱۳۔ دکنی کی مخصوص شعری اصناف (اور دوسرے مضامین) ڈاکٹر حبیب نثار، 1995ء، ص:127

۱۴۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی زندگی کے حالات، مہدی نواز جنگ، 1900ء، ص:29

۱۵۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد حیات اور ادبی خدمات، ڈاکٹر حبیب ضیاء، ص:39,40

۱۶۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی زندگی کے حالات، مہدی نواز جنگ، 1900ء، ص: 29,

۱۷۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی زندگی کے حالات کی مہدی نواز جنگ، 1900ء، ص:30

۱۸۔ داستان ادب حیدرآباد، ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، 1982ء، ص:251-250

۱۹۔ ایوان اردو کراچی کا ماہنامہ ''سب رس'' جلد:9، شمارہ 9، اگست، 1986ء، ص:23

۲۰۔ ایضاً۔۔۔، ص:23

۲۱۔ ایضاً۔۔۔، ص:20

۲۲۔ ایضاً۔۔۔، ص:23

۲۳۔ ''نذر شاد'' مرتبین ڈاکٹر نارائن راج، پروفیسر حبیب ضیاء، 2009ء، ص:31

بابِ دوم

حیدرآبادی تہذیب کے نمایاں پہلو

حیدرآبادی تہذیبی نقوش:

شہر حیدرآباد کی بنیاد محمد قلی قطب شاہ نے ۹۹۹ھ میں یعنی 1591ء میں رکھی اور سب سے پہلے اس نے چار مینار بنوایا۔ یہ عمارت شہر کے درمیان میں ہے۔ یہ عمارت 189 فٹ بلند ہے۔ اور اس کے اوپر ایک مسجد اور مسجد کے سامنے ایک حوض ہے۔ محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔ اس نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے دور میں رعایا بہت خوش تھی وہ اپنی رعایا کا خاص خیال رکھتا تھا۔ وہ ہندو اور مسلم میں کوئی فرق نہیں کرتا تھا۔ اس کے دربار میں ہندو مسلم شعراء شامل تھے۔ اس دور میں سرکاری زبان فارسی تھی ہندو مسلم سب فارسی جانتے تھے اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ قطب شاہی دور میں ہندو مسلمانوں میں میل جول تھا۔ محمد قلی قطب شاہ نے ایک ہندو ممتاز شاعر پٹامٹا کوی کو اپنی سلطنت کا تلنگی ملک الشعراء بنایا۔ محمد قلی قطب شاہ نے ہندو تہواروں اور مسلم عیدوں پر بہت سے نظمیں لکھیں۔ مسلمانوں کے عیدوں، بقرعید، عید ملاد اور محرم کے علاوہ ہندوؤں کے تہواروں ہولی، دیوالی، دسہرہ سب پر اس نے نظمیں لکھیں۔ اس کے دور حکومت میں شہر حیدرآباد ایک مشترکہ تہذیب کا نمونہ تھا۔ وہ مشترکہ تہذیب کا دلدادہ تھا۔ اس کے دور حکومت میں شہر حیدرآباد کافی ترقی کی۔ اس نے شہر حیدرآباد میں طرز تعمیر فن و ادب، فنون لطیفہ وغیرہ وغیرہ کو ترجیح دی۔

اس کو اپنی رعایا سے محبت تھی رعایا کی خوش حالی کے لیے اس نے بہت سے انتظامات کئے۔ وہ ہندو اور مسلمانوں کو برابر سمجھتا تھا۔ اس نے حیدرآباد کے تمدن کو بنانے میں بہت بڑا حصہ لیا۔ اس نے یہاں ایسے تہوار منانے شروع کئے تھے جو اب تک سارے حیدرآباد میں لوگ مل جل کر مناتے ہیں۔ شہر حیدرآباد میں مختلف مذاہب کے لوگ مختلف زبانوں والے طور طریقے، مختلف نسلوں والے مل جل کر زندگی بسر کرتے تھے اور اب بھی مل جل کر رہتے ہیں۔ یہ محمد قلی قطب شاہ کی ہی دین ہے اس نے حیدرآباد شہر کے لیے اللہ تعالیٰ

سے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا قبول کی محمد قلی قطب شاہ نے جو دعا کی وہ نظم میں ہے نظم کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

رکھیا جوں تو دریا من یا سمیع

اس طرح اس کی دعا قبول ہوئی اور مختلف جگہوں سے لوگ آتے گئے اور حیدرآباد میں بستے گئے۔ شہر حیدرآباد کی تہذیب ہی ایسی ہے کہ اس شہر میں جو کوئی بھی آتا اس شہر کا اور اس کی تہذیب کا دلدادہ ہو جاتا ہے۔ یہاں کی مشترکہ تہذیب سب کو پسند آتی ہے چاہے وہ کسی بھی قوم کے ہو یا کسی بھی نسل کے یا کسی بھی مذہب ہر ایک کو یہاں کی تہذیب پسند آتی ہے کیونکہ یہ ایک مشترکہ تہذیب ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نے دکنی تمدن کے بنانے میں بہت بڑا کردار ادا کیا تھا۔ اس نے ایسے ملے جلے تہواروں کو منانا شروع کیا تھا جسے ہندو مسلم سب پسند کرتے تھے۔ جسے اب تک سارے حیدرآباد میں لوگ مل جل کر مناتے ہیں۔ جیسے تلسنکرات کے زمانے میں پتنگوں کے جلسے برسات میں مرگ لگنے کے وقت کے جشن، بادشاہ کی سالگرہ کے وقت شہر کی آئین اور مل جل کر جشن منانے کے انتظامات، بسنت اور نوروز کی رسمیں، محرّم میں دس دن تک عاشور خانے اور دیوڑھیوں کی رونق اور چھل پہل اور امام حسین کے نام پ• رفقیر بننے، شرعبت کی کھچڑی پکانے اور کھلانے کا طریقہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں جاری تھا اور ان کا لباس، رہن سہن بھی ملتا جلتا تھا۔

قطب شاہی سلطنت کے زوال کے بعد یہ شہر کچھ عرصہ تک خاموش رہا۔ اور جب آصف جاہی حکومت قائم ہوئی اور اس کے فرماں روا نظام علی خاں نے اپنا پایہ تخت اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل کیا تو اس شہر کی قدیم رونق پھر ابھر کر سامنے آئی اور دن بہ دن ترقی ہوتی گئی اور مسلسل آج تک ترقی کی راہ پر ہے۔ آصف جاہی دور میں شہر حیدرآباد کو چار چاند لگ گئے تھے۔ اس دور میں ہر جگہ اور ہر معاملات میں تبدیلیاں ہوئیں۔ فن و ادب، طرز تعمیر، فنون ولطیفہ، ادب و موسیقی، تاریخی عماتیں، تعلیمی مدارس، دواخانے، نقانے، مہمان نوازی، لباس، کھیل وغیرہ وغیرہ میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔

قطب شاہی سلطنت کے خاتمہ کے بعد بھی یہی رنگ قائم رہا۔ چنانچہ نظام علی خاں سے لے کر مہاراجہ کشن پرشاد تک جتنے امیر اور شریف گھرانوں کے بزرگ تھے وہ سب ایک ہی قسم کے لباس پہنتے تھے اور

جب تک ان کی تصویروں پر یہ نہ لکھا جائے کہ یہ کس کی تصویر ہے پتہ نہیں چلتا کہ یہ کسی مسلمان کی ہے یا ہندو کی۔ محمد قلی قطب شاہ کے زمانے سے آصف جاہی ہفتم کے عہد تک شہر حیدرآباد مشترکہ تہذیب اور طرز معاشرت کا گہوارہ رہا ہے۔

شہر حیدرآباد شروع سے ہی ایک انفرادی خصوصیت رکھتا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کے بعد ہندوستان کی ریاستوں میں حیدرآباد ہی سب سے بڑا تہذیبی مرکز رہا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نے شہر حیدرآباد فن تعمیر، فن و ادب، فنون لطیفہ کو ترجیح دی۔ قطب شاہوں نے کئی خوبصورت عمارتیں بنوائیں۔ ان میں قلعہ گولکنڈہ، قطب شاہی گنبد، چار مینار، جامع مسجد، گلزار حوض، چار کمانیں، خداداد محل، عاشور خانہ، دارالشفاء وغیرہ ان کی یادگار ہیں۔ اس کے علاوہ قطب شاہوں نے مقبرے بنوائے تھے۔ قطب شاہی دور میں بڑی بڑی سڑکیں بنوائی گئیں اور بازار تعمیر کئے گئے تھے جن میں چودہ ہزار دکانیں اور بارہ ہزار محلے تھے۔ مسجدیں، عاشور خانے، لنگر خانے، مدرسے، مہمان خانے کاروان سرائیں اور دواخانے تعمیر کروائے گئے تھے جو اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان سب کے لیے تھے ہندو مسلم سب شریک ہوتے تھے۔ شہر حیدرآباد کی تہذیب ایک مشترکہ تہذیب ہے۔ قطب شاہی دور کے بعد آصف جاہی دور نے شہر حیدرآباد کی باگ ڈور سنبھالی۔ آصف جاہی سلاطین نے بھی مشترکہ تہذیب کو پروان چڑھایا۔ اور قطب شاہی دور کے طرز تعمیر، فن تعمیر دواخانے آشور خانے، تعلیمی مدارس، فنون لطیفہ وغیرہ وغیرہ میں تبدیلیاں لائے اور ان کو ترقی کی راہ بخشی۔ آصف جاہی دور میں بھی بہت سے ہندو شعراء آصف جاہی دربار میں تھے اور بہت سے ہندو وزراء جلیل القدر عہدوں پر فائز تھے۔ مہاراجہ چندو لال سے لیکر مہاراجہ کشن پرشاد تک یہ سبھی آصف جاہی دور میں اعلیٰ عہدوں پر معمور تھے اور حکومت کی باگ ڈور اور انتظامیہ کو انھوں نے بہت وضع داری اور وفاداری سے سنبھالا جو آج بھی قابل قدر ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد شآد نے میر محبوب علی خاں اور میر عثمان علی خاں کے دور حکومت میں مدارالمہامی اور وزرائے اعظم کے عہدوں کو 22 سال تک زینت بخشی۔

سلطنت آصفیہ:

1707ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا۔ سیاسی انتشار کی وجہ سے دہلی میں مرکزی حکومت ہوگئی۔

دہلی کی سلطنت میں بڑا ضعف آ گیا۔ اس ہنگامہ سے تنگ آ کر میر قمرالدین علی خاں آصف جاہ نے دکن کی صوبہ داری کا انتخاب کیا اور حیدرآباد دکن میں 11/اکتوبر 1724ء کو سلطنت آصفیہ کی بنیاد ڈالی۔ دہلی سے برائے نام وابستہ رہے۔ 1857ء کے بعد مغلیہ سلطنت کا نام ونشاں باقی نہ رہا۔ انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کرلیا۔ 1858ء میں آصف جاہ نے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کرتے ہوئے بادشاہت کا اعلان کیا۔ حیدرآباد دکن کی سلطنت آصفیہ ایک مختار ملک مسلم مملکت کی حیثیت سے قریب سوا دوسو سال قائم رہی۔

فرخ سیر نے نظام الملک آصف جاہ اول کو دکن کی صوبہ داری پر مامور کیا۔ فرخ سیر کے بعد محمد شاہ نے کرسی وزارت سنبھالی تو اس نے آصف جاہ اول کو دکن سے سنبھل اور پھر مرادآباد منتقل کر دیا۔ پھر اس کے بعد انھیں وزارت کے عہدے پر مامور کر دیا۔ اسی دوران نادرشاہ نے دہلی پر حملہ کیا جس کی وجہ سے مغلیہ سلطنت پسپا ہوگئی۔ جب مرکزی سلطنت کمزور پڑگئی تو نظام الملک آصف جاہ اول نے دکن میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ یہیں سے دکن میں ایک نئی سلطنت کی داغ بیل پڑی جسے سلطنت آصفیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

غازی الدین علی خاں، ناصر جنگ، صلابت جنگ، میر نظام علی خاں، بسالت جنگ، ناصر جنگ تخت نشین ہوئے۔ صلابت جنگ نے 12 سال حکومت کی اور نظام علی خاں آصف جاہ دوم کہلائے یہ حکومت 42 سال تک قائم رہی۔ ان کے بعد سکندر رہ جاہ سوم ۔۔ ناصر الملک آصف جاہ چہارم اور افضل الدولہ آصف جاہ پنجم اس وقت ان کی عمر تین برس تھی حکومت کی۔ افضل الدولہ کے انتقال کے بعد میر محبوب علی خاں 1884ء میں تخت نشین ہوئے انہوں نے 11 سال تک حکومت کی۔ 1911ء میں انتقال کیا۔ اس کے بعد ان کے فرزند آصفیہ سلطنت کے آخری تاجدار نواب میر عثمان علی خاں نے 1911ء 1948ء تک تخت بادشاہت پر قائم رہے۔

نظام الملک کی سلطنت قائم ہوتے ہی دکن پھر سے آباد ہوگیا۔ گویا دوبارہ حیدراباد کی ادبی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی کا مرکز بن گیا۔ سماجی اصول اور تہذیبی قدریں فروغ پانے لگیں۔ سلطان العلوم آصف جاہ سابع کے عہد میں تعلیم کو ترقی ہوئی۔ تعلیم کے ساتھ اخلاقی اقدار پر زور دیا گیا۔ آصف جاہ اول سے لیکر آصف جاہ سابع تک اس سلطنت نے حیدرآباد کی سیاسی اور معاشرتی زندگی پر گہرا اثر ڈالا جو حیدرآبادی تہذیب کا

روشن باب ہے۔ میر محبوب علی خاں سادس اور میر عثمان علی خاں سابع کا دور دکن کی تاریخ کا وہ زریں باب ہے جس میں آپ کی رواداری سے ہندو، مسلم اتحاد، بھائی چارگی اور قومی یکجہتی کو جو تقویت ملی اس کی مثال ہندوستان کے کسی اور حصہ میں شاید ہی ملے گی۔

آصفیہ دور میں ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ دونوں طبقے مل جل کر رہنے لگے۔ اور امن وامان کی زندگی بسر کررہے تھے۔ آصف جاہ سادس میر محبقوب علی خاں اور آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں کے دور حکومت میں اتنا میل جول بڑھا کہ ہندو رسم و رواج مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں داخل ہوگئے۔ اسی طرح ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کی بعض روایات کو اپنا لیا۔ رہن، سہن، لباس، کھانے پینے، شادی بیاہ، بات چیت کے طور طریقے سب میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد شآد کو آصف جاہ سادس سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ آپ کا بہت ادب واحترام کرتے تھے۔ خود کو شاگرد خاص ہونے پر فخر کرتے تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد شآد بھی آصف جاہ سادس میر محبوب علی خاں کے لباس کے جیسا ہی لباس پہنتے تھے۔ وہ راجا تھے یہ وزیر مگر دونوں ایک ہی جیسے نظر آتے تھے۔ لباس میں کوئی فرق نہیں تھا۔

آصفی دور میں نمایاں تبدیلی:

قطب شاہی دور کے بعد آصفی عہد شروع ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں لباس میں بہت کچھ تغیر ہوگیا۔ نیمہ جامہ اور انگرکھا کی جگہ شیروانی نے لے لی۔ عورتوں کے لباس میں بھی قطب شاہی اور آصفی دور میں فرق ہوگیا۔ قطب شاہی عہد کی تصویروں سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں تنگ پائجامہ اور اس پر گھیر دار جامہ پہنا کرتی تھیں۔ بعض وقت سینہ کے اوپر کا حصہ کھلا ہوتا تھا۔ اس کے بعد جو لباس مسلمان عورتوں میں رائج ہوا وہ بالکل علیحدہ تھا۔ کسی قدر تنگ پائجامہ چولی، کرتی جن کو زرین طلائی اور نقرئی مسالہ لگایا جاتا تھا اور کھڑا دوپٹہ استعمال ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ بعض اعلیٰ خاندانوں کے ہندو گھرانوں میں بھی یہ لباس رائج تھا۔

آصفی دور میں یوروپین طرز پر چند زیور استعمال ہونے لگے تھے۔ مہندی، غازہ، اور عطر کی جگہ پوڈر، لونڈر، سینٹ، لپ اسٹک وغیرہ استعمال کرتے تھے۔ اور اب بھی یہی استعمال کررہے ہیں۔ بالوں کو بھی

مغربی طرز پر بنانے لگے۔ اور بالوں میں پھول لگانے کا ہندوی طریقہ مسلمانوں نے اپنالیا۔ دکن میں عام لوگ سے لے کر امیر سب اس طریقے کو اپناتے ہیں اور پھول، پوڈر، سینٹ سب لگاتے ہیں یہ سب آصفی دور میں ہی شروع ہوا تھا جو آج تک برقرار ہے۔ لباس سے بھی ہندو مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ سب ایک ہی جیسا لباس پہنتے تھے۔

ساڑھی یہ ہندو عورتوں کا خاص لباس ہے اس کو دکن کے مسلمانوں نے بھی اپنالیا۔ دکن کے بعض مقامات پر اس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ساڑھی کے ساتھ بلاؤز بھی رہتی ہے۔ حیدرآباد کی ساڑھی اور بلاؤز کو جاذبیت، کشش، دلفریبی، رعنائی اور خوبصورتی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے پیراہنوں کے مقابلے میں ساڑھی میں وقار بھی ہے اور نکھار بھی۔ ساڑھی نفاست اور سنجیدگی کی علامت ہے۔ اس کو بعض لوگ بہت شوق سے اب بھی پہنتے ہیں۔

قطب شاہی دور میں اور آصف جاہی دور میں مختلف اقسام کے غذائیں پکوان پکائے جاتے تھے۔ اور امیر و غرباء کو کھلایا کرتے تھے۔ حیدرآباد کے پکوان دنیا میں بہت مشہور تھے اور اب بھی مشہور ہیں۔

حیدرآباد کے پکوان:

قطب شاہی دور میں دکنی پکوان کو فروغ حاصل ہوا۔ اس دور میں ہمیں مختلف قسم کے پکوان پکائے جاتے تھے۔ جیسے امواتا مرغ، جوکر سروان، جوکر مرغ، چاکتہ اور مختلف اچار بھی شامل تھے۔ حیدرآباد میں محرم میں خاص پکوان پکائے جاتے تھے یہ قطب شاہی دور سے لے کر آصف جاہی دور اور مسلسل اب تک جاری ہے۔ قطب شاہی دور کے علاوہ آصف جاہی دور میں بھی پکوان کو فروغ حاصل ہوا اور اس میں مختلف لذیذ کھانے پکائے جاتے تھے۔ بادشاہ نظام ششم میر محبوب علی خاں غفران مکان کے دور حکومت میں ماما جمیلہ کے پکوان بہت مشہور تھے۔ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں کے دور حکومت میں میر حیدر کان نے روز انسٹیٹوٹ (Rose Institute) قائم کر کے پکوان کو فروغ دیا تھا۔ آصف جاہی دور میں باورچی خانے موجود تھے۔

نظام علی خاں کا باورچی خانہ:

نظم علی خاں آصف جاہ ثانی کا باورچی خانہ نواب انوار جنگ سے متعلق جو خلوت مبارک کے پہلو میں تھا روزانہ ایک سو بیس خوان خاصے کے تیار ہوتے تھے جو محل شاہی میں ارسال کئے جاتے تھے جو خاصہ تقسیم ہوتا اس کو سالم خاصہ، نصف خاصہ، اور پاؤ خاصہ کہا جاتا تھا۔ اور ہر ایک باورچی خانہ میں کئی کئی باورچی رکاب دار، اور دوسرے ملازم رہا کرتے تھے۔

امرائے پائیگاہ کے دستر خوان:

امرائے پائیگاہ کے دستر خوان پر مختلف قسم کے کھانے ہوتے تھے۔ جیسے لقمی کباب، سنبوسے، ورقی سموسے، نان کی روٹی، رومالی روٹی، روغنی روٹی، تندوری روٹی، خمیری روٹی، گیہوں کی روٹی، جواری کی روٹی، باجرہ کی روٹی، شیر مال، ڈبل روٹی، پھلکا۔ پراٹھے وغیرہ وغیرہ۔

عوامی دستر خوان:

عوامی دستر خوان پر مختلف قسم کے پکوان موجود رہتے تھے جیسے ناشتے میں کھچڑی، قیمہ، پاپڑ، انڈے، تلا ہوا گوشت اور پراٹھے، چپاتیاں، چٹنی، اچار، بڑیاں وغیرہ ان میں سے کچھ نہ کچھ غذائیں پر دستر خوان پر ضرور ہوتی تھیں اور اس کے علاوہ صبح ناشتے میں بعض اوقات نہاری اور شیر مال وغیرہ موجود رہتے تھے۔ امیر غریب ہندو، مسلم سب لوگ ان چیزوں کو پسند سے کھاتے تھے۔ اور دوپہر کے کھانے میں چاول کے مختلف پکوان پکاتے تھے جسے سادہ چاول، خُشکہ، کھچڑی، بریانی، پلاؤ، کچھی بریانی، پکی بریانی، سنہری پلاؤ، کوفتہ پلاؤ، مرغ پلاؤ وغیرہ پکتے تھے کھچڑی کی مختلف اقسام یہ ہیں قبولی کھچڑی، تہاری، چنے کی دال اور مسوری کی دال کی کھچڑی وغیرہ ان کے علاوہ مختلف غذائیں بھی پکائی جاتی تھیں جیسے کھاری سویاں، کھچڑہ، حلیم، دم کے روٹ کھارے روٹ، کری پف وغیرہ۔

گوشت کا سالن:

حیدرآباد میں گوشت کے سالن کے نام مختلف ہیں۔ اس کو مختلف طریقوں سے پکایا جاتا تھا۔

کباب، دم کے کباب، نرگسی کباب، کوفتہ کباب، کوفتے، شامی کباب، شکمپور، ٹٹی کا گوشت، سالم بکرے کا دم، قورمہ وغیرہ حیدرآبادی ہرترکاری میں گوشت دال کر سالن بناتے ہیں۔ حیدرآباد میں جو غذائیں استعمال کی جاتی تھیں۔ وہ بہت لذیذ اور مزیدار ہوتی تھیں۔

دالچہ حیدرآباد کا خاص پکوان اور اب بھی ہے۔ دالچہ اکثر کدو کا ہوتا تھا۔ اس میں بیگن اور ٹماٹر ڈال کر پکاتے ہیں۔ تل کی چٹنی بھی حیدرآباد کی خاص غذا ہے۔ بگھارے بیگن اور مرچھی کا سالن حیدرآباد کا ایک مخصوص سالن ہے۔ اور چاکنہ بھی حیدرآباد کی خاص غذا ہے۔ اس کو سادہ چاول کے ساتھ ہر امیر وغریب بہت پسند سے کھاتے ہیں۔ چاکنہ یہ اپنا ایک خاص ذائقہ رکھتا ہے اس میں بکرے کا سر، کلیجی اور جھری اور سردان ڈال کر پکاتے ہیں اور اس کو جوار اور گیہوں کی روٹیوں کے ساتھ کھاتے تھے اور آج بھی کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوپیازہ روسٹ مٹن پکوڑے، دہی بڑے، انباڑے کی بھاجی، چاول کی کڑی یعنی کھٹی کڑی جس میں گوشت آلو، ٹماٹر، منگے کی پھلی ڈال کر پکائی جاتی تھی یہ خاص کر حیدرآبادی پکوان ہے اور یہ صرف یہیں پکائی جاتی ہے۔ ان چیزوں کو حیدرآبادی بڑے شوق سے کھاتے تھے اور اب بھی پکا کر مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔ ان پکوانوں کے تعلق سے ایک کہاوت مشہور ہے۔

کھچڑی کے ہیں چار یار: قیمہ، پاپڑ، گھی، اچار

آصفیہ دور میں اچھے خاصے مزیدار پکوان پکائے جاتے تھے۔ اور روزآنہ غربا کو لذیذ کھانا کھلایا جاتا تھا آصفی دور کے باورچی خانہ کے بارے میں تاریخ گلزارآصفیہ میں یوں لکھا ہے:

> ''تاریخ گلزارآصفیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر عالم کے باورچی خانے سے روزآنہ تقریباً دوسوآدمی جن میں ان کے اقرباء، متوسلین، اور غربا کھانا کھایا کرتے تھے۔ ان کی ضیافت میں ہر دن کباب، شکم پور، بریانی، عمدہ قلیہ مزعفر، گلاب وشک وزعفران پڑاپا اور کباب ورقی سمو سے اچار اور مربوں سے بھرے رہتے تھے۔'' [1]

محرّم کی غذا:

حیدرآباد میں محرم بہت احترام کے ساتھ منائے جاتا تھا اور اب بھی منایا جاتا ہے۔ محرّم میں خاص غذا کھچڑی، ملیدہ، روٹ، چونگے روٹ، قہوہ وغیرہ پکائے جاتے تھے اور محرم میں جلوس نکالے جاتے تھے۔ حیدرآباد کا محرم سارے عالم میں مشہور ہے۔ محرم میں کھچڑی پکانے اور کھلانے کا طریقہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں رائج تھا۔ حیدرآباد میں پہلی محرم سے لے کر زیارت تک کھچڑی پکاتے ہیں اس کے علاوہ کھچڑی کچھ مخصوص موقعوں پر بھی پکائی جاتی ہے جیسے چھٹی، چھلے اور شادی عقد اور ناشتہ میں پکائی جاتی ہے۔ بچے کی چھٹی چھلے کے موقع پر کھچڑی پکا کر پانچ یا سات یا نو یا گیارہ گھروں کو بھیجی جاتی ہے۔ حیدرآباد کے قدیم گھرانوں میں یہ رواج ہے کہ روزانہ چاول پکاتے تو کسی ایک برتن میں ایک مٹھی چاول ڈالتے ہیں اور ہر مہینے کی نو چندی جمعرات کو ان چاولوں کی کھچڑی پکا کر فاتحہ دے کر کھاتے ہیں۔ حیدرآباد کے محرم کے تعلق سے ایک قصّہ ہے۔ نصیرالدین ہاشمی نے اس قصّہ کو بیان کیا ہے قصّہ ملاحظہ ہو:

> ''آج سے تین سو ستر سال پیش تر 27 ذی الحجہ کو سلطان عبداللہ قطب شاہ اپنے شاہی ہاتھی ''مورت'' پر سوار ہو کر حیدرآباد سے گولکنڈہ جا رہا تھا موسیٰ ندی چڑھی ہوئی تھی اور پانی ایک مہیب شور کے ساتھ بہہ رہا تھا ہاتھی جوش و تلاطم کو دیکھ کر مست ہو گیا۔ مہاوت کو ہلاک کر کے جنگل کی طرف نکل گیا۔ سلطان نے بہت کوشش کی کہ ہاتھی سے اتر جائے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ناچار اس پر سوار رہا اور جدھر ہاتھی چاہتا جاتا رہا۔ جب یہ اطلاع سلطان کی والدہ حیات بخش بیگم کو ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ جنگل کے درختوں پر کھانا اور پانی باندھ دیا جائے تا کہ ہاتھی جس درخت کے نیچے ٹھہرے سلطان کو غذا میسّر آ سکے۔ آخر ذی الحجہ تک یہی حالت رہی۔ محرم کا چاند دیکھ کر حیات بخش بیگم نے منت مانگی کہ اگر سلطان صحیح و سلامت واپس آ جائے تو چالیس من سونے کی زنجیر بنا کر

حسینی علم پر لے جائے گی۔اور وہاں خیرات کر دی جائے گی۔اس منت کے بعد ہاتھی کی مستی ختم ہوگئی اور وہ سلطان کو لے کر گولکنڈہ آ گئی۔ حیات بخش بیگم نے منت کے مطابق سونے کی زنجیر بنائی اور سلطان کو باندھ کر حسینی علم روانہ کیا اور یہاں اس کو توڑ کر خیرات کر دیا گیا۔'' ۲

سلطنت آصفیہ کے دور میں بھی محرم بڑے دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔محرم میں عاشور خانوں کو امداد دی جاتی تھی۔محرم میں سوگ منایا جاتا تھا۔حسینی علم کو نذر و نیاز دیتے تھے اور لنگر کی رسم قائم ہوئی تھی۔ نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد میں اس کا آغاز ہوگیا تھا اور فوجی جلوس کے ساتھ حسینی علم کو صرف خاص کی جانب سے نذر یا نقد رقم دی جاتی تھی اور یہ رسم 5 محرم کو انجام پائی تھی۔لنگر کے جلوس کے بارے میں نصیرالدین ہاشمی یوں رقم طراز ہیں:

میرے بچپن میں مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت مدارالمہام تھے اور لنگر کا جلوس فتح دروازہ اور محمد شکور کی مسجد کی جانب سے شروع ہوکر مہاراجہ کی دیوڑھی کے اندر سے ہوتے ہوئے پنچ محلّہ سے گذرتا ہوا چار مینار آتا تھا۔ لارڈ کرزن نے بھی مہاراجہ کی دیوڑھی سے لنگر کا جلوس معائینہ کیا تھا اور بے قاعدہ فوج کی تخفیف کا سلسلہ اس کے بعد ہی شروع ہوا۔'' ۳

حیدرآباد میں محرم کے وقت خاص کر شہدوں کی کھچڑی بڑی عمدہ پکائی جاتی تھی۔مکہ مسجد میں شہدے قدیم سے تھے ان کے یہاں ہر روز صبح کھچڑی پکتی تھی۔محرم میں کھڑی پکا کر اس پر نذر و نیاز کرتے تھے اور دوسروں کو بھی بانٹ دیتے تھے۔

کھچڑی کم وقت میں پکتی ہے اور جلد ہضم ہونے والی غذا ہے۔اس کے علاوہ شربت، روٹ، چونگے وغیرہ شیرین کھانوں کو تقسیم کرتے تھے۔شربت کے ٹھیلوں کو رنگا جاتا تھا اور دو دو چار چار آٹھ آٹھ ٹھیلیاں تقسیم کرتے تھے۔شربت کی ٹھیلوں کو رنگا جاتا تھا اور دو دو چار چار آٹھ آٹھ ٹھیلیاں تقسیم کرتے تھے۔ اس کے علاوہ محرم میں فوج میں باقاعدہ تعزیئے (تابوت) بنتے اور دس محرم کی رات کو فوجی جلوس کے ساتھ

مہاراجہ کی دیوڑھی میں جاتے اور معمول وصول کرتے تھے۔فوجی رسالوں کے بیسوں اور دوسرے سینکڑوں ادنیٰ لوگوں کی جماعتیں ہاتھوں میں چھوٹے بڑے مشعل لیے ہوئے دارالشفا سے پتھرگتی اور مہاراجہ کی دیوڑھی تک گشت کرتے تھے۔یہ مختلف نعرے لگاتے ہوئے جاتے تھے۔

حلیم یہ بھی حیدرآباد کی خاص غذا ہے۔اور یہ حیدرآبادیوں کی سب سے عزیز ولذیذ غذا ہے۔اس کو اکثر رمضان میں افطار کے وقت پکاتے ہیں۔حلیم کی تیاری میں گیہوں، مٹن اور مختلف قسم کے دالوں اور مصالحہ جات استعمال کرکے پکاتے ہیں۔''بنے نواب حلیم'' بھی مشہور ہے۔حلیم حیدرآباد میں ہر جگہ ملتا ہےاور اس کو ہر کوئی امیر غریب، ہندو مسلم، بچے بوڑھے پسند کرتے ہیں اور کھاتے ہیں۔

حیدرآبادی تہذیب کا نمونہ مہاراجہ کشن پرشاد شآد:

مہاراجہ کشن پرشاد شآد مشترکہ تہذیب کا نگینہ تھے۔یہ حیدرآباد کی تہذیب کا نمونہ تھے۔ان کے خاندان کے افراد ابھی باحیات ہیں۔ان کے نبیرہ ہندو اور مسلم حیدرآباد میں مشترکہ تہذیب کے زندہ مثال ہیں۔مسلم اپنے مذہب پر اور ہندو اپنے مذہب پر قائم ہیں۔شآد کے دربار میں اکثر شعراء شمالی ہند سے آئے تھے اور وہ زیادہ تر یہیں کے ہو رہے۔جوشؔ ملیح آبادی ایک بار ان کے دربار میں آئے تھے وہ مہاراجہ کشن پرشاد شآد کی تہذیب کے بارے میں کہتے ہیں۔

> ''مہاراجہ کی تہذیب دیکھئے کہ ان کے منھ پر ان کے وطن کو اور وہ بھی سر دربار واعلیٰ روس الاشہاد برا بھلا کہا گیا لیکن ہر چند ان کے چہرے پر پشیمانی کا رنگ دوڑا مگر زبان سے اُف تک نہیں کی۔قاضی کی اس بران گفتاری کو ضبط کرنے میں دو تین منٹ لگ گئے۔مہاراجہ کو اور انھوں نے اپنی خوش خلقی کا سہارا لے کر مجھ سے کہا جوشؔ صاحب آپ کی زبانی یہ معلوم کرکے قاضی فقط ریاضی دان ہی نہیں شاعر بھی ہیں مجھے اشتیاق پیدا ہو گیا کہ ان کے کلام سے بہرا ندوز ہوں۔قاضی نے کہا نئیں نئیں نئیں مجھے اپنا کلام یاد نہیں مطلق مطلق یاد نہیں۔یہ کہہ کر قاضی نے اپنا

سیدھا ہاتھ ان کی طرف پھیلا دیا اور بار بار انگلیاں اٹھا اٹھا اور جھکا جھکا کر کہنا شروع کر دیا۔ آپ کچھ سنائیں سنائیں سنائیں۔ آپ کچھ سنائیں۔ان کی اس لونڈوں کی سی حرکت پر میں عرق عرق ہو کر رہ گیا۔ دل میں سوچا کہ دنیا میں کلام سنانے کی کہیں اس طرح بھی فرمائش کی جاتی ہے۔مگر اللہ رے مہاراجہ کی خوش خلقی اس ادائے فرمائش کو بھی پی گئے اور اپنی بیاض منگائی کہا میں کل سے بے حد گلو گرفتہ ہوں۔ جوشؔ جب آپ کوئی غزل اس بیاض سے سُنا دیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں نے آنکھیں اٹھائے بغیر کہا مہاراج مجھ کو آپ کی سنت جاریہ کا علم ہے کہ جب آپ کا کوئی نیاز مند اپنے مہمان کو آپ کی خدمت میں لاتا ہے تو آپ اس کی میزبانی فرماتے ہیں۔۔۔۔۔لیکن میری یہ استدا ہے کہ ۔۔۔۔میں اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ مہاراجہ نے جلدی سے میری بات کاٹ کر فرمایا جوشؔ صاحب آپ ہرگز شرمندہ نہ ہو۔ میں قاصی صاحب سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں اس لئے کہ اس قیامت کا بےلوث، نڈر، بے جھجک اور صاف گو انسان آج تک میری نظر سے نہیں گزرا ہے اور یہ وہ پہلے شخص ہیں جن کو تہذیب ریاکار بنانے میں ناکام ہو کر رہ گئی ہے۔ مہاراجہ کی ان باتوں سے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا اور ان کی دعوت منظور کر کے گھر آ گیا''۔[۲۴]

مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ جوشؔ ملیح آبادی کو اور قاضی صاحب کو اپنے گھر پر دعوت دیتے ہیں۔دعوت میں کیا کیا چیزیں تھیں اور کیا کیا ہوا۔اس کے بارے میں جوشؔ کے ہی زبان میں سنیے۔

''جب ہم کھانے کی میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے تو پلیٹیں گردش کرنے لگیں اور چپاتیاں بھی قاب میں لا کر سامنے رکھ دی گئیں۔ چپاتیوں کو دیکھتے ہی انھوں نے کہا ارے چپاتیاں آ گئیں میں نے آنکھوں آنکھوں

میں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور چپ ہو گئے۔ اتنے میں کوفتوں کی ڈش آ گئی۔ انھوں نے گن کر پانچ کوفتے اپنی پلیٹ میں رکھ لئے۔ کوفتہ چکھ کر خوش ہو گئے اور یہ کہا کہ جوشؔ میاں چکھ کر دیکھو کس مزے کا کوفتہ ہے ایک کوفتہ میری جانب لڑھکا دیا۔ وہ سفید میز پوش پر ایک پیلی لکیر ڈالتا میرے ہاتھ سے آ کر ٹکرا گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا گویا مجھ پر بم پھٹ پڑا ہے۔ جب کھانا ختم ہو گیا تو ایسا لگا کھانا نہیں کھایا بلکہ کھانا مجھ کو کھا کر رخصت ہو گیا ہے''۵؎

کھانا، پینا، گانا، رقص، محفل میں شعر و شاعری کرنا اس دور میں تہذیب کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ جب یہ کھانے کے بعد محفل میں رقص و سرود کے لئے دوسرے کمرے میں آ گئے وہاں پر کیا ہوتا ہے اور مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ اپنے غصّے کو کس طرح پی جاتے ہیں۔ اس سے شادؔ کی تہذیب معلوم ہوتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''جوشؔ اور قاضی کھانے کے بعد رقص و سرود کے جگمگاتے کمرے میں آ گئے۔ تمام حاضرین مہاراجہ سمیت دوزانو بیٹھ گئے۔ جوش نے کہا کہ قاضی دوزانو بیٹھنا ہوگا۔ انھوں نے بڑے اکراہ کے ساتھ کہا تمھاری محبت میں یہ بھی بھگت لیں گے۔ اب گانا شروع ہو گیا اور تانیں وانیں بل کھانے لگیں۔ تھوڑی دیر میں قاضی نے میرے کان میں کہا دم نکلا جا رہا ہے دوزانو بیٹھنے سے۔ جوش نے کہا برآمدے کے صوفے پر جا کر بیٹھ جاؤ۔ قاضی نے زور سے کہا وہاں سے رنڈی نظر نہیں آئے گی۔ تمام محفل میں یہ فقرا گونج اٹھا اور وہ بڑے اطمینان سے پلتھی مار کر بیٹھ گئے۔ ان کی اس حرکت پر لوگوں کی نظریں اٹھ گئیں۔ جوشؔ نے آنکھیں جھکا لیں۔ انھیں ٹھوکا دیا کہ دوزانو بیٹھ جائیں مگر وہ حسب عادت پھر اوں، اوں، اوں کرنے لگے۔ اور خدا کا شکر کہ سارنگی کے روں روں

نے ان کی اوں اوں جذب کرلی۔۔۔۔ یہ جادو کا سما بندھا ہوا تھا کہ
قاضی نے اپنے گھٹنے پر تال دیتے ہوئے پوچھا یہ کس کی غزل ہے؟
جوشؔ نے کہا ''مہاراجہ کی یہ سنتے ہی قاضی نے اپنے پھیپھڑوں کو پوری
طاقت سے ''سبحان اللہ'' کا ایسا نعرہ لگایا کہ مہاراجہ یہ سمجھ کر یکا یک نظام
دکن تشریف لے آئے ہیں۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور جب
قاضی نے دوبارہ ''سبحان اللہ'' کا نعرہ بلند کیا تو مہاراجہ یہ بات محسوس
کر کے وہ نظام کے بجائے قاضی کے روبرو ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں۔
جھینپ کر بیٹھ گئے اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اور جب گھر آ کر جوشؔ
نے کہا '' کیوں قاضی آخر کار مہاراجہ کو ہاتھ جڑوا کر تو نے دم لیا تو وہ
داڑھی کھجانے لگے۔''[۶]

اس اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد صبر و تحمل سے کام لینے والے تھے وہ ادیبوں اور شاعروں کی قدر کیا کرتے تھے وہ صبر رکھنے والی شخصیت تھی۔

اس کے علاوہ مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد میں اور بھی کئی خوبیاں تھیں۔ وہ کسی سے خفا نہیں ہوتے تھے۔ محمد اسحاق مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سنتے ہیں ک ان کے محل کے سامنے ایک فقیر بیٹھا رہتا اور مہاراجہ ہر ماہ
اس کو وظیفہ کے طور پر کچھ رقم دیتے کسی کو پتہ نہ تھا۔ ایک دن اس فقیر
نے کچھ رقعہ بھیجا اور وہ پڑھ کر مسکرانے لگے کسی مصاحب نے پوچھا کیا
ہے؟ مہاراجہ نے وہ خط ان کے ہاتھ دے دیا۔ اس شخص نے مہاراجہ کو
بے حساب فحش گالیاں لکھی تھیں۔ مصاحب نے کہا اس کا وظیفہ کیوں
بند نہیں کر دیتے۔ لیکن مہاراجہ کا سلوک اس کی موت تک برابر جاری رہا
اور کبھی اس سے خفا نہیں ہوئے'' [۷]

اس سے پتہ چلتا ہے مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد عمدہ شخصیت اور صبر رکھنے والے تھے۔ ایسے لوگ آج

کے دور میں بہت کم نظر آتے ہیں۔

حیدرآباد کے کھانے سالنوں اور میٹھوں کے مختلف اقسام درج ذیل ہیں جو آصف جاہی دور میں پکائے جاتے تھے۔ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہیں:

کھانے اور سالنوں کی فہرست:

۱۔ امباڑہ گوشت	۲۔ ابنیل
۳۔ بریانی دوگوشہ	۴۔ بکھارا کھانا
۵۔ بُرہانی	۶۔ بُتگی
۷۔ بھُرتہ	۸۔ بگھارے بیگن
۹۔ پسندے	۱۰۔ پسندے کے سیخ کباب
۱۱۔ پھولوں کا خشکہ	۱۲۔ پھول کچنار
۱۳۔ تہاری (طہاری)	۱۴۔ ترکاری پلاؤ
۱۵۔ تاتاری قیمہ	۱۶۔ جہازی قورمہ
۱۷۔ چاکھنا	۱۸۔ اچار
۱۹۔ چُگر گوشت	۲۰۔ چگر جھینگے
۲۱۔ چُونگے	۲۲۔ حلوان
۲۳۔ حلیم	۲۴۔ خمیری روٹی
۲۵۔ خاگینہ	۲۶۔ دال ماش
۲۷۔ دالچہ	۲۸۔ دوپیازہ پنیر
۲۹۔ دم کا گوشت	۳۰۔ دم کے کباب
۳۱۔ دم کا مرغ	۳۲۔ دم کا قیمہ
۳۳۔ دم کے بیگن	۳۴۔ ریشمی پراٹھے

۳۵۔ روغنی روٹی

۳۶۔ رائتہ

۳۷۔ سالم بکرے کا دم پخت

۳۸۔ سموسے (سمبوسے)

۳۹۔ سُکھ مُکھ

۴۰۔ سوالیاں

۴۱۔ سلطانی دال

۴۲۔ سلطانی دو پیازہ

۴۳۔ سنہری پلاؤ

۴۴۔ سہاجنہ کی پھلی کی کڑی

۴۵۔ سری پائے

۴۶۔ سویا کلیجی

۴۷۔ سردان (شیر دان، چُستے)

۴۸۔ شاہ پسند دال

۴۹۔ شکمپور (شکمپر)

۵۰۔ شب دیگ

۵۱۔ شیر مال

۵۲۔ شولہ

۵۳۔ طوطک

۵۴۔ طاس کباب

۵۵۔ خرفے کی کتلی

۵۶۔ قورمہ

۵۷۔ قبولی

۵۸۔ قیمہ میتھی

۵۹۔ قیمہ بھرے ٹماٹے

۶۰۔ قیمہ بھرے کریلے

۶۱۔ قیمہ بھری مرچیں

۶۲۔ قیمہ شاہی

۶۳۔ قیمہ نارنج

۶۴۔ کٹ (کتھی اور ٹماٹے کا)

۶۵۔ کوزی

۶۶۔ کھچڑی

۶۷۔ کھاری سویاں

۶۸۔ کھچڑا

۶۹۔ کوفتہ کا سالن

۷۰۔ کوفتہ کباب

۷۱۔ کوفتہ پلاؤ

۷۲۔ کڑھائی کے پسندے

۷۳۔ کھڑی دال

۷۴۔ کری پف

۷۵۔ لُقمی

۷۶۔ ماہی قلیہ

۷۷۔ مرغ پلاؤ

۷۸۔ کٹھی دال

۷۹۔ مرغِ مسلّم
۸۰۔ مرغ کا یخنی پلاؤ
۸۱۔ مرغ کی حلیم
۸۲۔ مونگ کی بڑیاں
۸۳۔ مصالحہ کی بڑیاں
۸۴۔ ماش کی دال
۸۵۔ مرکھ (مرق)
۸۶۔ مُضاب
۸۷۔ مذبیح
۸۸۔ مُطبخ
۸۹۔ مرغ تلّہ
۹۰۔ مُضبح
۹۱۔ مرغ تندوری
۹۲۔ محسنی دالچہ
۹۳۔ محسنی قورمہ
۹۴۔ مرچ کا سالن
۹۵۔ مچھلی (مختلف اقسام)
۹۶۔ نہاری
۹۷۔ نرگسی کباب
۹۸۔ دالا جاہی قورمہ
۹۹۔ ورقی سمبوسے
۱۰۰۔ ہریس
۱۰۱۔ ہرسیہ

میٹھوں کی فہرست:

۱۔ انڈے کا حلوہ
۲۔ انڈے کی پیوسی
۳۔ امرود پھل
۴۔ امرتی
۵۔ آسان
۶۔ اندرسہ
۷۔ بالوشاہی
۸۔ بادام کا حلوہ
۹۔ بادام کی جالی
۱۰۔ بادام کے میوے
۱۱۔ بیڑے
۱۲۔ بادام کی ترکاریاں
۱۳۔ بادامی پوریاں
۱۴۔ بونٹ کا حلوہ
۱۵۔ بیسن کا لڈو
۱۶۔ برفی

۱۷۔ جلیبی

۱۸۔ چھینی

۱۹۔ پٹی کا حلوہ

۲۰۔ پنجیری

۲۱۔ پھولوں کا میٹھا

۲۲۔ پستہ بادام کا حلوہ

۲۳۔ پورن پوری

۲۴۔ پڈنگ مختلف اقسام

۲۵۔ جیلی ہمہ اقسام

۲۶۔ جوزی حلوہ سوہن

۲۷۔ چکولیاں

۲۸۔ حلوہ پوری

۲۹۔ حلوہ سوہن

۳۰۔ حب کے لوز

۳۱۔ حبشی حلوہ

۳۲۔ خوبانی کا میٹھا

۳۳۔ خریاں

۳۴۔ خشتِ عدن

۳۵۔ دم کے روٹ

۳۶۔ دہی کے لوز

۳۷۔ دہی کے بالوشاہی

۳۸۔ ڈبل کا میٹھا

۳۹۔ روے (سوجی) کا حلوہ

۴۰۔ روٹ

۴۱۔ راب اور بادام پستے کے لڈو

۴۲۔ راب اور مونگ پھلی کے لڈو

۴۳۔ روے کی برفی

۴۴۔ رتالو کی کھیر

۴۵۔ سویّوں کا میٹھا

۴۶۔ شکر پارے

۴۷۔ شیر خرما

۴۸۔ فیرنی

۴۹۔ قلاقند

۵۰۔ کڑاہی کی کھیر

۵۱۔ کھوے کی برفی

۵۲۔ کدو کی کھیر

۵۳۔ کدو کے لوز

۵۴۔ گھیور

۵۵۔ گوند کے لڈو

۵۶۔ گل بہشت (گل فردوس)

۵۷۔ گلگلے سادہ

۵۸۔ گلگلے شیرہ دار

۵۹۔ گلاب جامن

۶۰۔ گوشت کا میٹھا

۶۱۔ گاجر کا حلوہ
۶۲۔ لڈو
۶۳۔ مالیدہ
۶۴۔ میٹھے چاول
۶۵۔ مٹھائی کے انار
۶۶۔ مربہ جات ہمہ اقسام
۶۷۔ مزعفر
۶۸۔ ماقوتی
۶۹۔ میدے کی پوریاں
۷۰۔ مغزیات کے لوز
۷۱۔ مَن وسلوٰی
۷۲۔ موضوف
۷۳۔ محبوبیاں
۷۴۔ ناریل کی مٹھائی [8]

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کو بھی کھانے اور کھلانے کا بہت شوق تھا۔ وہ خود اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاتے تھے۔ آصف جاہی دور میں مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کی طباخی مشہور تھی۔ کشن پرشاد شاؔد اس طباخی کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''میرا یہ شوق مستقل تھا میں نے مختلف طباخوں سے انواع واقسام کے اغذیہ پکانے سیکھے۔ اگر کوئی ایک مہینہ تک ہر روز نئی اغذیہ کے پکانے کی فرمائش کرے تو میں ایک مہینے تک ہر روز نئے میٹھے پکا کے انشاء اللہ کھلا سکتا ہوں۔ مجھے اکثر موقع سفر اور حضر میں پیش آئے اور ہر وقت میں اپنے آپ کو مدد دیتا رہا'' [9]

حیدرآباد میں چٹنیوں کو بھی بہت شوق سے کھاتے تھے۔ ان کی کئی اقسام ہیں۔ ایک ایک دسترخوان پر کبھی کبھی ۶۰ سے زیادہ چٹنیاں رکھی جاتی تھیں۔ صفی اورنگ آبادی مہاراجہ کشن پرشاد کے دربار میں شاعر تھے۔ انھوں نے مہاراجہ کشن پرشاد کو کھانے کی دعوت دی تھی۔ اس دعوت میں کیا تھا؟ اس کے بارے میں محمد اسحاق لکھتے ہیں:

> ''صفی اورنگ آبادی مہاراجہ کے مصاحبین میں سے تھے۔ اونچے درجے کے شاعر تھے۔ شاعر ہو یا ادیب بے چارے کے پاس سوائے

دولت کے سب کچھ ہوتا ایک دن انھوں نے عرض کیا کہ حضور ہم تو آپ کی دعوتیں کھاتے ہی رہتے ہیں کبھی غریب خانے پر تشریف لائیں تو ہماری عزت و منزلت میں اضافہ ہوگا ''جو بھی روٹی چٹنی ہے حاضر کردونگا'' مہاراجہ نے فوراً منظور کرلیا اور کہا شرط یہ ہے کہ ''دسترخوان پر سوائے روٹی چٹنی کے کچھ اور نہ ہوگا، وقت پر مہاراجہ دس پندرہ منٹ کے بعد مصاحبین کے ساتھ صفی کے مکان پر پہنچے۔ دیکھا ایک وسیع دسترخوان لگا ہے۔ مہاراجہ نے کہا ''یہ سب کیا ہے؟'' صفی نے جواب دیا یہ صرف روٹی اور چٹنی ہی تو ہے۔ شاہی باورچیوں نے ساٹھ (60) قسم کی روٹیاں اور ساٹھ (60) قسم کی چٹنیاں تیار کیں تھیں۔'' [10]

اس کے علاوہ حیدرآباد کے چند دسترخوانوں پر سو سے زیادہ قسم کی میٹھی اور کٹھی چٹنیاں اور جوار کی روٹی اور پراٹھے، لقمیاں وغیرہ پروسے جاتے تھے۔ اس طرح حیدرآباد کے کئی پکوان اور دسترخوان تھے آصف جاہی دور میں غریبوں کو لذیز کھانا کھلایا جاتا تھا۔

مہمان نوازی:

مہمان نوازی بھی حیدرآباد کی ایک خاص رسم ہے۔ حیدرآبادی مہمان نوازی میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ حیدرآباد کی مہمان نوازی کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں حکومت انگریزی کے زمانے میں برٹش انڈیا کے اعلیٰ سول اور فوجی عہدے داروں کے علاوہ انگلستان کے شاہی خاندان کے افراد اور پھر ہندوستان کے گورنر جنرل حیدرآباد آتے تھے۔ گورنر جنرل جو حیدرآباد آئے ان میں لارڈ رپّن سے آغاز ہوا۔ اور لارڈ مونٹ بیٹن کے سوا باقی گورنر جنرل حیدرآباد آئے تھے۔ پرنس آف ویلز کی حیثیت سے کنگ جارج اور کنگ ڈیوڈ اور جرمنی کے ولی عہد حیدرآباد آئے

تھے۔دیسی ریاستوں کے کئی راجے مہاراجے آتے رہے ان کے حسبِ مراتب حکومت آصفیہ کی جانب سے مہمان نوازی ہوتی رہی۔“ [11]

لباس:

لباس تہذیب کی ایک اہم نشانی سمجھی جاتی ہے لباس سے اس کی تہذیب پہچانی جاتی ہے۔ حیدرآبادیوں کا لباس ایک اہمیت رکھتا ہے۔کسی بھی تہذیب کا معیار اس کی زبان،غذا،لباس،رہائش،رہن سہن،چال چلن،بات چیت اور لباس کے ذریعہ سے معلوم ہوتی ہے۔قطب شاہی دور میں مسلمان مرد لمبی قبا،نیم جامہ استعمال کیا کرتے تھے۔کبھی تنگ اور کبھی گھیرے دار ہوا کرتے تھے۔بعض لوگ ڈگلا پہنتے تھے اور اچکن بھی پہنا کرتے تھے۔محمد قلی قطب شاہ نے بھی اپنے لباس میں تبدیلی کی۔نصیرالدین ہاشمی محمد قلی قطب شاہ کے لباس کے بارے میں لکھتے ہیں:

”محمد قلی قطب شاہ نے جو قطب شاہی خاندان کا پانچواں بادشاہ تھا اپنے بدن سے تاتاری لباس بالکل اتار پھینک دیا۔سر پر سمور کی کلاہ کے بجائے دکنی وضع کی پیچ دار پگڑی،رکھی۔برے کی پوستین اور باناتی کی جگہ ململ کا جامعہ اور شبنم کا نیمہ پہنتا تھا اور ہاتھوں میں جڑاؤ کڑے پہنے اور داڑھی کا صفایا کر دیا تھا“ [12]

قدیم زمانے میں حیدرآبادی ہندو مرد دھوتی اور قمیص پہنتے تھے۔مسلمان مرد کرتے،قمیص اور پاجامے پہنا کرتے تھے۔اس دور میں جو لباس پہنتے تھے وہ زرین اور مصالحہ دار ہوتے تھے۔آصف جاہی دور میں کئی تبدیلیاں آئیں۔اس دور میں لباس میں بہت کچھ تغیر ہو گیا تھا۔نیمہ جامہ اور انگرکھا کی جگہ شیروانی نے لے لی تھی۔شیروانی کے ساتھ قمیص،ململ کا کرتا دوہرا پائجامہ یا بڑے پائچوں کا پاجامہ،سر پر پگڑی دستار، مختلف قسم کی ترکی ٹوپیاں،پاؤں میں سلیم شاہی جوتے موزے اور شوز بوٹ سب ہی پہننا کرتے تھے۔یہ لباس سبھی پہنا کرتے تھے۔ لباس سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلم۔دربار میں جانے کے لیے بگلوس اور دستار لازمی سمجھے جاتے تھے۔

درباری لباس:

آصفی خاندان کے ابتدائی حکمرانوں کے دور میں درباری لباس میں دستار جامہ، اور بگلوس معہ تلوار لازمی تھے۔ جامہ عموماً باریک ململ کا اور گھیردار ہوتا تھا۔ آستینیں تنگ ہوتی تھیں۔ مختارالملک مدارالمہام کے دور میں جامہ کی جگہ شیروانی آ گئی۔ میر عثمان علی خاں کے زمانے میں درباری لباس دستار، شیروانی، بگلوس اور پاجامے پر مشتمل تھا۔ علماء اور مشائخین دستار کی بجائے عمامہ باندھا کرتے تھے۔ مخصوص حالات میں بعض امراءکو ان کے خاندانی لباس زیب تن کرنے کی اجازت تھی۔ صدر اعظم کے سامنے درباری لباس پہن کر جانا لازمی تھا۔ یوروپین افسروں کا لباس سوٹ بوٹ پہننے کا عمل بھی آصف جاہی دور میں ہی شروع ہوا تھا۔ آصف جاہی دور میں مغربی افسر مہمان بن کر حیدرآباد آئے تھے اس لئے ان کے اثر سے تعلیم میں اور لباس میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی تھیں۔

دولہے کا لباس:

دستار یا پگڑی دولہوں کے سر کا لباس ہوا کرتا تھا۔ یہ دستار یا پگڑی ململ کی ہوتی تھی۔ دستار پگڑی اور عمامے کے ساتھ زرین ریشمی شملے بھی سر کے لباس میں شامل ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ریشمی قمیص، تاش کا پائجامہ (تمان) تاش کا انگرکھا اور تاش کی پگڑی بھی پہنا کرتے تھے۔ حیدرآباد کے دولھے کا خاص لباس شیروانی تھی۔ اور اب بھی ہے۔ یہ آصف جاہی دور سے شروع ہوئی تھی شیروانی اس کو حیدرآبادی بڑے شوق سے پہنتے ہیں۔ شادی بیاہ میں اس کو ضرور پہنا کرتے ہیں۔ حیدرآباد کے دولھے کی شادی شیروانی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ بعض دولھے بغیر شیروانی کے شادی کے لیے راضی ہی نہیں ہوتے۔ شیروانی کی حیدرآباد میں خاص اہمیت ہے۔ شیروانی کے ساتھ دولھوں کو آپا شاہی جوتے اور پھر زری کا جڑاوا استعمال کرتے تھے شیروانی کے تعلق سے محمد اسحاق لکھتے ہیں:

> ’’1949ء میں پنڈت جواہر لال نہرو حیدرآباد آئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں تقریر اردو میں کی۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ پنڈت جی چوڑی دار پاجامہ اور سلک کی نفیس شیروانی میں ملبوس تھے۔ پھر حیدرآباد کی شیروانی

قومی لباس ہوگئی۔ تمام صدور جمہوریہ کا لباس یہی شیروانی ہے۔ ہمارے اس وقت کے وزیراعظم وی۔ پی۔ سنگھ کی شیروانی تو مشہور ہوچکی ہے۔ شیروانی حیدرآبادی تہذیب کی خاص علامت رہی ہے۔ اس لباس میں نہ معلوم آدمی کیوں شریف معلوم ہوتا ہے۔ اس کے زیب تن کرتے ہی آدمی میں نفاست اور وقار کی جھلک آجاتی ہے۔ بلکہ شیروانی تہذیب و شرافت کی علامت ہے۔'' ۱۳؎

دلہنوں کا لباس:

دلہنوں کا لباس پیشواز اور بکلائی تھا۔ اس کو زرین کپڑوں سے بنایا جاتا تھا۔ اور قیمتی مصالحہ لگا کر تیار کیا جاتا تھا۔ پیشواز اور بکلائی کے ساتھ کرتی چولی اور پاجامہ بھی ہوتے تھے۔ اور اس کے علاوہ اوڑھنی، کھڑا دوپٹا، دوپٹا، گھاگھرا، چولی بھی استعمال کرتے تھے۔ دلہنوں کے لیے خاص زرین جوتے اور زرین جڑاوا بھی استعمال کئے جاتے تھے۔

بچوں کا لباس:

حیدرآباد میں بچوں کے لباس بھی مختلف اقسام کے ہوتے تھے۔ مرد بچوں کا لباس کارچوبی، ٹوپی سفید کرتا اور ڈھیلا پائجامہ (تمان) کہلاتا تھا جو سُرخ سبز یا پیلے مشروع کا ہوتا تھا۔ بچوں کو کارچوبی ٹوپی اور مخمل اطلس کی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ململ یا چکن کے کرتے، بنین سفید ہرک پاجامے پہنا کرتے تھے۔

عورتوں کے لباس میں بھی قطب شاہی اور آصفی دور میں فرق ہوگیا تھا۔ قطب شاہی عہد میں عورتیں تنگ پائجامہ اور اس پر گھیردار جامہ پہنا کرتی تھیں۔ اور آصف جاہی دور میں بھی اس لباس کو استعمال کرتے تھے اس کے علاوہ ساڑی قمیص، جاکٹ اور بلوز پہنا کرتی تھیں۔

ساڑی:

یہ ایک خاص لباس ہے جس کو سب لوگ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی پہنتے ہیں۔ساڑھیاں مختلف تھیں قسم کی ہوتی تھی۔ ہر طبقہ کے لوگ اس کو اپنی مرضی سے پہنتے ہیں۔ ساڑھی کو ہر دور میں زبردست مقبولیت حاصل رہی ہے۔ حیدرآباد کی ساڑھی اور بلاؤز کو جاذبیت، کشش، دلفریبی، رعنائی اور خوبصورتی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے لباسوں کے مقابلے میں ساڑھی میں وقار بھی ہے اور نکھار بھی۔ ساڑھی نفاست اور سنجیدگی کا مظہر ہے۔ کنواری لڑکیاں اوڑھنیاں، دوپٹے اور شرٹ شلوار پہنا کرتی تھیں۔ اور حیدرآباد کی عورتیں کرتی چولی کلی دار پاجامہ اور چھ گز لمبے دوپٹے پہنتی تھیں۔ ہندو عورتیں چولی اور ساڑھی اور لہنگا پہنا کرتی تھیں۔اس کے علاوہ بھی مختلف اقسام کے لباس موجود ہیں۔جن کو شوق سے پہنا جاتا تھا۔عورتوں کے لباس کے بارے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''عورتوں کے ملبوسات، کپڑوں کی قسموں، قلی کے اشعار میں جہری، نیم گنی، ساڑی، سنچالی، رومال اور دیگر ملبوسات کپڑوں کی اقسام تافتار، زربفت، ریشم، زینہ والدخوصی ایک قسم کا کپڑا اور تنکٹ کا کام وغیرہ''[۱۴]

حیدرآباد کی مسلم عورتیں، ساڑی، تنگ پاجامہ اور گھیر دار جامہ پہنا کرتی تھیں۔اس کے علاوہ کسی قدر تنگ پاجامہ، چولی کرتی جن کو زرین طلائی اور نقرئی مصالحہ لگایا جاتا تھا۔ چھ گز کا دوپٹہ اوڑھا کرتی تھیں۔ کھڑا دوپٹہ استعمال ہوتا تھا۔ساڑی کے ساتھ جمپر اور بلوز پہنا جاتا تھا۔ساڑیاں معمولی، کھادی، سوتی، ریشمی اور زرین کی ہوتی تھیں۔عورتوں کے لئے سر پر پلو ڈالنا لازمی تھا۔

ترکی ٹوپی:

انیسویں صدی کے آخری زمانے سے حیدرآباد میں ترکی ٹوپی کا بہت رواج ہوگیا تھا۔امراء بھی دستار کے علاوہ ترکی ٹوپی پہننے لگے تھے بیسویں صدی میں بالوں کی ٹوپی بھی کا استعمال ہوتا تھا۔ بالوں کی سیاہ ٹوپی معین الدولہ کی ایجاد تھی اس کے برعکس سامنے پتلی اور پیچھے چوڑی ٹوپی سالار جنگ ثالث کی اختراع تھی۔امرا اپنے گھروں میں کارچوبی کی نوکدار ٹوپی بھی پہنتے تھے۔

پھُندنا:

ٹوپی کے ساتھ ''پھُندنا'' لازمی جزو ہوتا تھا۔حضور نظام بغیر پھُندنے کی ٹوپی پہنتے تھے۔شہزادگان اور حضور نظام کے قریبی رشتے دار بھی پھُندنا نہیں لگاتے تھے۔ پھُندنے کی صنعت حیدرآباد میں گھریلو صنعت میں شمار ہوتی تھی عموماً ایک سو(۱۰۰) ڈوری کے پھُندنے کا رواج تھا۔ڈیڑھ سو اور دو سو ڈوریوں کے پھُندنے بھی استعمال ہوا کرتے تھے۔اب ان کا استعمال متروک ہوتا گیا۔

اس مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں مرد اور عورتوں کے ملبوسات خوبصورت ہوتے تھے۔لباس بھی تہذیب کی ایک نشانی سمجھی جاتی ہے۔آج کے دور میں لباس میں کئی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔یہ مخصوص طرز زندگی حیدرآباد میں نظر آتی ہے۔

زیورات:

زیور عورت کا گہنہ ہے۔خواتین لباس کے بعد زیور بہت شوق سے پہنتی ہیں۔زیور کے بغیر خواتین کا سنگھار ادھورا رہ جاتا ہے۔قطب شاہی دور سے لے کر آج تک خواتین زیورات کو بہت شوق سے پہنتی ہیں۔زمانہ کوئی بھی ہو خواتین زیور پہنا نہیں چھوڑتیں۔شادی بیاہ اور تقاریب میں زیور کو بہت استعمال کیا جاتا ہے۔زمانہ قدیم سے ہی خواتین زیور پہننے کا شوق رکھتی ہیں خواتین اور زیور ایک دوسرے کے لازم وملزم ہیں۔زیور کے مختلف اقسام ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

سر کے زیور:

جھومر: اسے بالوں سے متصل بھنوؤں کے کنارے لٹکاتے ہیں۔

لاکڑی:

لاکڑی وہ طلائی زیور ہے جس کی شکل گول سرپوش سے ملتی جلتی ہے۔جس پر نقش ونگار کے علاوہ نگینے جوڑ دیئے جاتے ہیں۔

مرزہ بے پروا:

یہ ایک ایسا زیور ہے جس کے تین چھوٹے چھوٹے جڑوا پھولوں کی تین طلائی لڑیوں میں لٹکایا جاتا ہے۔ پیشانی سے اوپر بائیں جانب سر کے بالوں میں جماتے ہیں یہ دراصل عجمی زیور ہے جس کے پہننے کے بعد کسی اور زیور کے پہننے کی پروانہیں رہتی۔

چوٹی کا تعویذ:

طلائی زنجیر میں چھوٹے چھوٹے تین تعویذوں کے آویزے چوٹی کے تعویذ کہلاتے ہیں۔ یہ زیور بڑا متبرک مانا جاتا ہے

چوٹی کے جتے:

چوٹی کے آخری حصہ پر چار قبوں کا ایک جھومر لٹکایا جاتا ہے۔ ہر قبہ نصف گیند کی صورت میں سونے سے بنایا جاتا ہے۔

چوٹی کی لاٹری: اس زیور کا رواج دراصل ہندوانہ ہے جسے مسلم خواتین نے بھی اپنایا۔ لاکڑی سے متصل چھوٹی چھوٹی طلائی رائریوں کا سلسلہ چوٹی کے آخری حصہ تک چلا جاتا ہے۔

ماتھے کا زیور، ٹیکہ:

اس زیور کو کہتے ہیں جو مانگ کے مقابل ماتھے پر لگایا جاتا ہے۔ یہ بیضوی شکل کا ایک ٹیکہ ہوتی ہے جس میں قیمتی نگینے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

کان کے زیور انتی:

انتی وہ زیور ہے جو کان کے آخری حصّے میں پہنا جاتا ہے یہ ایک حلقۂ طلاء کا نام ہے جس میں دو موتی اور دونوں کے بیچ میں ایک رنگین نگینہ پروتے ہیں۔

ادراج بھٹّے بُگڑے سنکھے

بالی	جھلملی	جھمکا	چاند بالیاں
چکریاں	چولا پھول	کرن پھول	

ناک کا زیور، بلاق:

یہ ایک طلائی حلقہ میں موتی کا آویزہ لگا ہوا زیور بلاق کہلاتا ہے۔ یہ ناک میں پہنا جاتا ہے۔

ناک کی دال: یہ زیور نہایت مختصر درحقیقت دال کے دانے کے برابر ہوتا ہے۔ جس میں قیمتی نگینہ جڑا رہتا ہے۔

نتھ:

اس حلقۂ طلاء کو نتھ کہتے ہیں جو بطور زیور کے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں دو موتی ہوتے ہیں ان کے درمیان ایک زمردی یا یاقوتی یا سرخ منکہ ہونا ضروری ہے یہ زیور سہاگ کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ دولھا کی طرف سے دولہن کو عطا کیا جاتا ہے عورتیں اس زیور کو بڑی اہمیت دیتی ہیں۔

گلے کے زیور:

تلسی	جگنی	چمپاکلی	چنتاک
چندن ہار	ستلڑا	گلسر	لچھّا
مالا	ہار		

بازوں کے زیور:

بازوبند	بازو کے کڑے	کنگی بیڑی	نورتن

کلائی کے زیور:

پہنچی	سمرن	چوڑیاں	کنگن
گوٹ	موتی کا جوڑا		

پنجہ کے زیور:

آرسی　　انگوٹھی　　چھلّہ

پاؤ کے زیور:

بیڑی	پازیب	پائل	توڑا
گجرا	لول	منکے	

پاؤں کے انگلیوں کے زیور:

گھول: پاؤں کی انگلیوں اور خاص کر انگوٹھوں میں جو پہلے پہنے جاتے تھے انھیں گول کہتے ہیں عموماً یہ چاندی سے بنائے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ حیدرآباد میں مردانہ زیورات کو بھی اہمیت دی جاتی تھی۔ دکن میں مرد زیورات کثرت سے پہنتے تھے۔ سلاطین اپنے امرائے سلطنت اور روساء وغیرہ پر جب کبھی جود وکرم کی بارش کرتے تو عہدوں سے سرفراز کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں زیورات سے بھی نوازتے تھے۔ شاہانِ آصفیہ کی داد و دہش اس بارے میں ضرب المثل تھی۔ سلاطین آصفیہ بہت دریا دلی تھے۔ وہ اپنے درباریوں کو جواہرات و زیورات سے مالا مال کر دیتے تھے۔ جو زیورات عطا کئے تھے وہ حسب ذیل ہیں:

''۱۔ سرپیچ　　۲۔ سرپٹّی　　۳۔ جیفہ

۴۔ طُرّہ　　۵۔ کلغی　　۶۔ کنٹھی

۷۔ ہار　　۸۔ مالا　۹۔ بازوبند

۱۰۔ بھجند　۱۱۔ نورتن　　۱۲۔ دست بند اور سمرن وغیرہ''

۱۵

اس کے علاوہ سلاطین آصفی بطور تحفہ و انعام اشرفی بھی دیا کرتے تھے۔ ایسے کئی زیورات ہیں جن کو حیدرآبادی بڑے شوق سے پہنا کرتے ہیں مثلاً کنٹھ، مال، کنگن، گل سری، گوش پارے، کمر پٹہ، ٹھسی بینا،

جھجھیر ہانس، ہانسلی، حمائل طرہ، چوسرا، کرن پھول، پچپین ٹھیلری، بند ٹیلا (ٹیکہ) جگنی، ناگ سر، سرلڑی، کنموتی بنگڑیاں (چوڑیاں) اور گلے کی زنجیر وغیرہ۔

حیدرآباد کے رسم و رواج:

رسم دراصل عربی لفظ ہے جو مونث ہے جس کے لغوی معنی نقش، نشان، دستور قاعدہ، آئین، قانون، ریت اور رواج کے ہیں۔ حیدرآباد میں قطب شاہی اور آصف جاہی دور کئی رسومات میں تبدیلیاں آئیں۔ محمد قلی قطب شاہ جو کہ ایک مسلم ہونے کے ساتھ ساتھ اس نے ہندو رسومات کو اپنائے۔ اس نے ہندو مذاہب کے لباس کو اپنایا اور ہندو خاتون سے شادی کیں۔ محمد قلی قطب شاہ کے دور سے لے کر آصفی دور میں ہندو مسلم سب یکجہتی سے رہتے تھے اور ایک دوسرے کے رسم و رواج کو اپناتے تھے۔ یہ ایک مشترکہ تہذیب تھی۔ اور اب بھی ہے۔ مشترکہ تہذیب کو قائم رکھنے میں قطب شاہی اور آصف جاہی دور میں اہم کارنامے انجام دیئے۔ مسلم حکمران اپنے دربار میں ہندو امرا کو رکھتے تھے۔ ان کو بڑے بڑے عہدوں سے نوازا اور ان کے بہت سے رسومات اپنائے۔

شادی بیاہ کی رسمیں:

شادی بیاہ کے وقت بہت سے رسومات انجام دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً مانجھے کی رسم، سانچق کی رسم، مہندی کی رسم، ہلدی کی رسم، جلوے کی رسم وغیرہ وغیرہ۔

جب کسی لڑکی یا لڑکے کی شادی کی بات طے ہو جاتی ہے تو لڑکی والے اور لڑکے والے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ جب رشتہ پکا ہو جاتا ہے تو سب سے پہلے منگنی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

منگنی:

منگنی شادی بیاہ کی اولین رسم ہے۔ اس رسم میں لڑکا لڑکی نسبت طے ہو چکی ہے۔ اس موقع پر لڑکے والے ہونے والی دلہن کے لیے انگوٹھی اور پھولوں کا گہنا لے جاتے ہیں۔ پھولوں کا گہنا چاندی یا سلور کے چنگیز دان میں لے جاتے ہیں۔ اس میں انگوٹھی، مصری، پان، ابٹن اور صندل کی تھالیوں یا چینی کی

طشتریوں میں الگ الگ رکھ کران کو چوبی کشتی میں سلیقے سے جما لیتے ہیں اور کشتی کو رنگین کپڑے میں لپیٹ کر اوپر اطلس یا کارچوب کا کشتی پوش رکھ دیتے ہیں۔ یہ سب لے کر دلہن کے گھر پہنچتے ہیں۔ دُلہن کو مسند پر قبلہ روبٹھایا جاتا ہے۔ کوئی بزرگ خاتون دلہن کو صندل لگاتی ہیں پھولوں کا ہار پہناتی ہیں۔ اس کے بعد سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی میں سُرخ نگینے والی طلائی انگوٹھی پہنائی جاتی ہے۔ انگوٹھی کے بعد چاندی کا چھلاّ بھی پہناتی ہیں۔

ہلدی کی رسم:

ہلدی کی رسم مسلمانوں نے ہندوؤں سے لی ہے۔ عقد سےتقریباً پندرہ دن پہلے سے شادی کا سامان منگوایا جاتا ہے اور اس میں ہلدی بھی منگوائی جاتی ہے۔ شادی کے سات دن پہلے سات سہاگن عورتیں چکّی کے اطراف بیٹھتی ہیں۔ اس کے بعد چکّی کا رسم ہوتا ہے یعنی چکی کو صندل لگایا جاتا ہے اور چکی کے کھونٹے کو لال ناڑا باندھا جاتا ہے۔ پھر یہ سات سہاگن اپنے ہاتھوں سے چکی میں ہلدی ڈال کر پیستی ہیں۔ پیسنے کے بعد یہ ہلدی سات دن تک روزانہ دلہن کو لگا کر نہلاتے ہیں۔ اور دولہا دلہن کو پیلے کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔

پاؤں میز:

پاؤں میز کی رسم حیدرآباد میں بڑی دھوم دھام سے ادا کی جاتی ہے۔ اس رسم میں دولھا والے دلہن کے گھر جا کر لڑکی کے پاس چوڑیوں اور جوتے کا ناپ لیتے ہیں۔ دولہا والے مٹھائی کے علاوہ کپڑوں کا ایک جوڑا زیور اور پھولوں کا گہنا وغیرہ کئی کشتیوں میں سجا کر لے جاتے ہیں۔

جوڑے کی رسم:

پاؤں میز کی رسم کے بعد دلہن کے عزیز و اقارب دولھا کو جوڑے کی رقم دینے جاتے ہیں۔ مٹھائی کی کشتیاں اور پھولوں کا چنگیز ساتھ ہوتا ہے۔ تاشہ مرفہ اور ڈھولک بجانے والوں کی جماعت بھی ساتھ رہتی تھی۔ مذکورہ رقم وہی ہوتی ہے جو جوڑے اور گھوڑے کے عنوان سے طے پائی تھی۔ اس رقم کے وصول ہونے کے

ساتھ ہی مشاطہ کو اس کا حق الخدمت دے دیا جاتا ہے۔اور انعامی جوڑا نکاح کے وقت دیا جاتا ہے۔

بی بی کی صحنک:

مانجھے سے ایک دن قبل سرِ شام خشکہ، دہی اور کھڑی دال صحنکوں میں رکھ کر حضرت فاطمتہ الزہرا کے نام سے فاتحہ دلوائی جاتی ہے اور یہ صحنک پاک خواتین کو کھلائی جاتی ہے۔ یہ خواتین صحنک کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اس کمرے میں (جہاں دولہا یا دلہن مانجھے بیٹھتی ہے) اپنے ہاتھوں سے دیواروں پر صندل کے چھاپے مارتی ہیں۔

رَتجگاہ:

فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد رات میں محلّہ کی عورتیں جمع ہو کر ملیدہ اور رحم تیار کرتے اور گلگلے تلتے ہیں۔ساری عورتیں مل کر میلاد خوانی کرتی ہیں۔ملیدہ اور گلگلے کھاتی ہیں۔دوسرے دن ملیدہ، رحم اور گلگلے محلوں والوں اور قریبی رشتہ داروں کے پاس بھجواتے ہیں۔

مانجھا:

مانجھا رتجگا کے دوسرے دن شادی سے ایک ہفتہ قبل دولہن اور دولہے کو غسل کے بعد ہلدی میں رنگے ہوئے پیلے کپڑے پہنا دیتے ہیں۔دلہن اور دولہے کو کسی سہاگن کے ذریعہ ہلدی کا چکسہ لگایا جاتا ہے۔اور صندل بھی لگایا جاتا ہے۔خوب ہنسی مذاق ہوتا ہے۔سارا گھر خوشی سے گونج اٹھتا ہے۔

خواجہ خضر کے جہاز:

مانجھے کے دن خواجہ خضر کے نام سے خوبصورت چھوٹے چھوٹے جہاز پھڑوائے جاتے ہیں۔ جہاز بانس، ابرک اور رنگیں کاغذ اور پنّی سے تیار ہوتے ہیں جن میں سات قسم کے میوے باندھ کر لٹکاتے ہیں اور درمیان میں ایک چومکھ (چار بتوں والا چراغ) آٹے کا بنا کر اس کو روشن کیا جاتا ہے۔اس میں حسب حیثیت روپے پیسے رکھتے ہیں۔ان جہازوں میں سے ایک جہاز دولہا یا دلہن اپنے سر پر رکھ کر کچھ دور بطور رسم چلتے

ہیں۔اس کے بعد یہ جہاز ''عربانہ'' کے ہاتھ کسی حوض یاباؤلی یا تالاب میں چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔

سانچق (ساچق)

اس کو بَری بھی کہتے ہیں۔لفظ ساچق ترکی زبان میں حِنا بندی کے معنوں میں مستعمل ہے۔دکن میں اس کا تلفظ سانچق کہا جاتا ہے یہ رسم عقد کے ایک دن پہلے دولہا کے گھر سے دلہن کے گھر بڑی دھوم دھام سے لے جاتے ہیں جس میں نقل، بادام،مصری، دلہن کا لباس،پھلیل،عطر،سہاگ کا جوڑا، رنگ بھرے ہوئے شیشے، پسی ہوئی ہلدی، مہندی، مٹھائی، میوہ جات، چھالیہ،الائچی، سامان آرائش، چوڑی کے جوڑے،عطر، تیل، پوڈر، کنگی، برش، آئینہ،سرمہ، کاجل،مِسّی، غازہ وغیرہ ہوتا ہے۔

گودبھرائی:

مصری کی چنائی کی رسم کے بعد طرفین کے مہمانوں کی خاطر تواضع ہوتی ہے۔اس کے بعد جس مسند پر سمدھنیں بیٹھتی ہیں۔اس کے قریب ایک چوکی بچھائی جاتی ہے۔اس پر سُرخ کپڑا بچھا کر دلہن کو لاکر بٹھاتے ہیں۔دلہن کو پھولوں کا گہنا پہنایا جاتا ہے۔دلہن کی ہونے والی خوش دامن سیدھے ہاتھ کی درمیانی انگلی سے دلہن کے ہونٹوں پر مِسّی لگاتی ہے۔اس کے بعد دلہن کی گود بھری جاتی ہے۔مراثنیں ڈھولک بجاتی ہیں۔مختلف گیت گاتی ہیں۔دلہن پر سے مہمان عورتیں روپے نچھاور کرتی ہیں۔

مہندی:

یہ رسم ساچق کے دوسرے دن ادا ہوتی ہے۔دلہن کے گھر سے دولہا کے گھر مہندی جاتی ہے۔ ساچق میں دولہا کے گھر سے جتنی مٹھائی آئی تھی اس سے دوگنی دولہا کے گھر لے جاتے ہیں۔دولھا کے لیے شادی کے دن پہننے کے کپڑے، جوتے، چاندی کی کھڑاویں، صابن دانی، کنگھا، برش، آئینہ،عطردان، چکسہ ہلدی، مہندی،صندل وغیرہ لے جاتے ہیں۔اوراس کے بعد دولہا کی ہونی والی چھوٹی سالی دولہا کے ہاتھ کی انگلیوں میں مہندی لگاتی ہے اس اثناء میں دولہا کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے اور اس وقت تک نہیں چھوڑتی جب تک دولہا کی جانب سے معقول نذرانہ وصول نہیں کیا جاتا۔اس کے ساتھ ہی وارن پھیرن شروع ہوجاتی ہے۔

اس دور میں شادی بیاہ کے موقع پر میراثنیں یہ گیت گایا کرتی تھیں ؛

''تمھیں یہ شادیاں جم جم مبارک ہو، مبارک ہو مچی ہے دھوم شادی کی ،

مبارک خانہ آبادی وہ شہزادہ یہ شہزادی مبارک ہو، مبارک ہو۔'' ۱۶

شب گشت کی رسم:

سب سے پہلے دولہا کو غسل کرایا جاتا اور مانجھے کے دن اس نے جو پیلا کرتا یا قمیص پہنا تھا اس کی بجائے گلابی یا سرخ قمیص پہنایا جاتا اور پاتابے (موزے) بھی گلابی یا سرخ ہوتے۔ مشجّر ہمرو یا ٹوئیڈ کی شیروانی دستار یا ترکی ٹوپی پہنائی جاتی دولہا دو رکعت نفیل نماز ادا کر کے بارات کے ساتھ دلہن کے گھر پہنچتا ہے۔

سہرے کا رواج:

سہرا موتیوں یا مقیش کے تاروں یا صرف پھولوں کی لڑیوں سے بنایا جاتا ہے جو بطور نقاب دولہا کے سر پر باندھتے ہیں۔ جب دولہا سہرا باندھ کر بارات کے ساتھ دلہن کے گھر پہنچتا تو اس وقت کیسا منظر ہوتا ہے ملاحظہ ہو۔

> ''جب دولہا دو رکعت نفیل نماز ادا کر کے سر پر سہرہ باندھ کے بارات کے ساتھ روانہ ہوتا، بارات میں پہلے بینڈ باجے والے ہوتے ان کے بعد عروب ٹمکیا بجاتے، ناچتے کودتے اور تلوار کا پھیر کرتے ہوئے ''ہول بوشول بو'' پکارتے اور گاتے دولہا اور بارات میں شامل لوگوں سے انعامات لیتے ہوئے دلہن کے گھر پہنچتا ہے تو وہاں پھاٹک کو بند پاتا۔ پھاٹک کو بند کر دینے یا راستہ روکنے کی رسم دلہن کے بھائیوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس مزاحمت کا نام دکن کی اصطلاح میں ''دھنکا نہ پکڑنا'' ہے۔۔۔ پانچ سات کا یہ مشغلہ اس وقت ختم ہوتا ہے جب

دولہا کی طرف سے سالے کونقدی دے کر راستہ کھول دینے پر راضی کرلیا جاتا ہے۔۔۔۔۔اس کے بعد دولہا کو دلہن کے پاس لایا جاتا ہے جہاں ایک پردہ ہوتا ہے۔اس پردے کی اوٹ سے دلہن والے دولہا پر چاول اور پھول اور مصری نچھاور کرتے ہیں اور پھر یہی عمل دولہا کی طرف سے بھی دہرایا جاتا ہے۔اس کے بعد دولہا کو مسند پر بٹھایا جاتا ہے۔اور قاضی صاحب عقد کرواتے ہیں''۔ ۱۷

اس کے بعد حیدرآباد میں جلوہ کی رسم ادا کی جاتی ہے۔جلوہ کی رسم کوبھی حیدرآباد میں خاص اہمیت دی جاتی ہے۔

جلوہ کی رسم:

یہ رسم شام میں مغرب کے بعد شروع ہوتی ہے۔اس رسم میں دولہا اور دلہن کوایک پلنگ یا مسند پر آمنے سامنے بٹھایا جاتا ہےاورآرسی مصحف کی رسم ادا کرتے ہیں اس رسم کوجلوہ کی رسم کہتے ہیں۔آرسی اس انگوٹھی کو کہتے ہیں جوانگوٹھے میں پہنی جاتی ہےاس میں نگینہ کی بجائے چوّنی یا اٹھنی کے برابر گول آئینہ لگا رہتا ہے جس میں منہ دیکھتے ہیں۔آرسی مصحف کی رسم سے مراد وہ عمل ہے جبکہ دولہا اور دلہن کوایک پلنگ پر بٹھا کر دونوں کےاوپر سُرخ چادرڈال دیتے ہیں۔اور دونوں کوایک ساتھ قرآن پاک دکھاتے ہیں اورآئینہ میں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے کے لیے کہا جاتا ہے۔

رُخصتی کی رسم:

جلوہ کی رسم ختم ہوتے ہی رُخصتی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔رُخصتی کے وقت دلہن کے ماں باپ دولہا سے یہ کہہ کر رخصتی دیتے ہیں کہ بیٹا ہماری لاڈلی بیٹی اب سے آپ کی بیوی ہے۔ہم نے اس کو بڑے لاڈ پیار سے پالا ہےاس کوکوئی تکلیف نہ ہونے دو۔اب اس کی ذمہ داری صرف آپ کی ہے۔اس طرح رُخصتی کی رسم ہوتی ہے رُخصتی کے رسم کے وقت دلہن کی سہلیاں،رشتہ دار،ماں باپ سب روتے ہوئے دلہن کورخصت کرتے ہیں۔

بازگشت:

رخصتی کے رسوم کے بعد دولہا دلہن کو لے کر اپنے گھر واپس لوٹتا ہے۔ وہ دلہن کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر موٹر میں بٹھاتا ہے اور خود بھی اس موٹر میں بیٹھ جاتا ہے یہ موٹر پھولوں سے سجی ہوئی رہتی ہے۔ اس طرح دولن، دولہا کے گھر پہنچتی ہے۔ دولہا اور دلہن کے پاؤں کو دودھ سے دھوتے ہیں۔

دلہا گھر پہنچنے کے بعد کی رسم:

دلہا والے گھر پہنچتے ہی بکرا یا مرغ صدقہ کے طور پر خیرات دیتے ہیں۔ وہ لوگ جو شادی کی تقریب میں کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکے تھے وہ آ کر دلہن کا منہ دیکھ کر سلامی دیتے ہیں۔ اس کے بعد دلہن والوں نے دلہن کے ہمراہ ''ساتھ کا برتن'' یعنی کھانا جو وافر مقدار میں بھیجا تھا سب مل کر کھاتے ہیں۔ دولہا دولہن کو فیرنی کھلائی جاتی ہے۔

چوتھی:

شادی کے دوسرے دن دلہن کے بھائی کھیر کھچڑی لے کر ناشتہ مرفہ بجانے والوں کے ساتھ دولہاں کے گھر جاتے ہیں اور دلہن ان کے ساتھ میکے آ جاتی ہے۔ اس دن رات میں دلہن کے گھر پر چوتھی کی رسم ادا ہوتی ہے۔ یہ تقریب شادی کی آخری رسم ہے۔ پھولوں اور ترکاریوں سے چوتھی کھیلی جاتی ہے۔ پھولوں کی چھڑیوں سے دولہا کی پٹائی ہوتی ہے۔ اس تقریب میں بڑی چہل پہل ہوتی ہے۔ ہنسی مذاق دل لگی ہوتی ہے اور قہقہوں کی محفل سجی ہوئی رہتی ہے۔

ولیمہ:

چوتھی کے دوسرے دن یا دو تین دن بعد دولہا کے والدین کی طرف سے دعوت ولیمہ دی جاتی ہے۔ یہ دعوت مذہبی احکام اور سنت نبوی کی اتباع کے طور پر بھی لازمی ہوتی ہے۔ شادی کے مقابلے میں لوگوں کی تعداد کم ہوتی ہے۔

جمعگی:

شادی کے بعد پہلے جمعہ کو دلہن والوں کے پاس دولہا اور اس کے قریبی عزیز و رشتہ دار کی دعوت ہوتی ہے۔ دوسری جمعگی دولہا کے پاس ہوتی ہے اور بقیہ تین جمعگیاں عزیز و اقارب کے پاس ہوتی ہیں۔ ہر جمعگی میں دولہا اور دلہن کو پھول پہنایا جاتا ہے۔ عطر لگایا جاتا ہے اور پان بیڑہ ان کی گود میں رکھتے ہیں۔

پان پھول اور عطر کا رواج:

پان، پھول اور عطر کے بغیر شادی بیاہ کے رسوم مکمل نہیں ہوتے۔ حیدرآباد میں ان چیزوں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ پان کے بارے میں اقبال قدیر جہاں لکھتی ہیں:

> ''شاہان مغلیہ سے سلطنت آصفیہ کو جو چیز اس ورثہ میں ملیں، ان میں سے ایک پان کا استعمال بھی تھا۔ دکن میں سلیقہ سے پان کا رواج بھی تھا۔ پاندان جہیز کا ایک نام ہے۔ یہ شادی میں ضرور دیا جاتا ہے۔ پاندان میں کھتہ، چونا، سروطے کی کٹی ہوئی سپاری، الائچی، چکنی، لونگ، نرملی، جوز، جوتری وغیرہ پاندان میں جمادئے جاتے ہیں۔ ہر پاندان میں ایک چاندی کا آئینہ اور پان کی ڈبّی جھیلہ چاندی کا اور چھوٹی پان کی کشتی بھی ہوتی ہے۔ امرا کے یہاں چکنی سپیاری دودھ میں بھگو کر بڑے سلیقے سے کٹوائی جاتی تھی۔ پان کے ساتھ نرملی بھی حیدرآباد میں بہت استعمال کی جاتی ہے۔ پان کے بیڑے مہمانوں کو بڑے اہتمام سے پیش کئے جاتے تھے۔ نرملی ایک درخت کی بیج ہے یہ صرف دکن کے پہاڑی علاقوں میں نرملی کے درخت پائے جاتے ہیں۔ پاندان بنانے والے کاریگر اکثر کریم نگر سے تعلق رکھتے ہیں۔ کریم نگر میں چاندی کے جال کا کام بہت عمدہ بنتا ہے۔ پاندان خاص دان، اگال دان اور پان کی تھالی ہر گھر میں ہوتی ہے۔'' [۱۸]

حقہ کا رواج:

قدیم زمانے میں امراءحُقہ پیا کرتے تھے۔ بعد میں سگار، سگریٹ اور بیڑی کا استعمال کیا جانے لگا۔ حیدرآباد میں چار مینار اور گولکنڈہ سگریٹ کی فیکٹریاں بہت مشہور ہیں۔ امیر غریب سب مرد بیڑی اور سگریٹ پیتے ہیں۔

حیدرآباد کی مامائیں:

اس دور میں حیدرآباد میں مامائیں بہت مشہور تھیں۔ شاہانِ آصفیہ جب دہلی سے حیدرآباد آئے تو اپنے ساتھ مامائیں بھی لے آئے۔ جن کے وہ زیر پرورش بھی تھے۔ آصف جاہ نے دکن میں ماماؤں کو بہت سے اختیار دئے تھے۔ ماماؤں کو ان پر کافی اعتبار تھا۔ ماما بڈن، ماما چمپا، ماما شریفہ، ماما جمیلہ مشہور تھے۔ ماما جمیلہ حیدرآباد کی مشہور تاریخی ماما تھی۔ اس نے بہت عروج حاصل کیا تھا۔ محبوب علی بادشاہ کی مسند نشینی چونکہ صغیر سنی میں ہوئی تھی اس لئے دربار میں وہ ماما جمیلہ کی گود میں تشریف فرما تھے۔ یہ مامائیں قابل، تعلیم یافتہ اور ہوشیار ہوتی تھیں۔

ماماؤں کی لباس:

حیدرآباد کی شادی تقاریب، جشن، عید، سالگرہ کے موقعوں پر مامائیں اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ ان کا لباس بھی مخصوص تھا۔ وہ سفید ململ کی کرتی اور چولی ہمرو، شرویا، سوسی کا پاجامہ پہنتی تھیں۔ اس کے علاوہ ململ کا چھ گز کا دوپٹہ جسے رنگ کر چنا جاتا تھا اوڑھتی تھیں۔ ڈنڈے کی کڑیاں کنگیاں اور چوٹی کے موتی ہوتے اور قدیم طرز کا جوتا پہنتی تھی۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر یہ ناچتی اور گاتی تھیں۔

حیدرآباد کی ماماؤں کے بارے میں تمکین کاظمی لکھتے ہیں:

> ''حیدرآباد کی گھریلو زندگی میں ماما کو وہی مقام حاصل تھا جو یورپ میں گورنرس خواتین کو حاصل ہوتا تھا۔ سارے گھر کی نگرانی کرتی، کپڑے لاتی، شادی بیاہ کی ریت رسوم کا اہتمام، کھانا پکانا، پیام، سلام، خیر خوبی،

گھریلو ذمہ داریاں ماما جی نبھاتیں (آج سے پچاس سال پہلے کا ماحول تھا) ملکہ کو گھر کے جنجال سے کوئی واسطہ نہ تھا، منصب دار، جاگیردار رقم لاکر بیگم صاحبہ کے پاس بھجوادیتے۔ بیگم صاحبہ مقررہ رقم مقدار ماما کے حوالہ کردیتیں۔ پکانے والی ماما‌ئی، اوپری کام کرنے والی ماما‌ئیں، کاماٹن، گارڈن وغیرہ الگ ہوتیں۔ شادی ہوتو ماما جی سمدھیانے میں جاکر بات چیت کرتیں۔ جوڑے چڑھاوے کا یقین، مہمانوں کی مقدار، ریت رسوم کی بات، زیور کپڑے خریدتیں اور گھر کی آرائش و زیبائش کیا کرتی تھیں۔'' [19]

حیدرآباد میں کئی اور مختلف رسمیں تھیں۔ ہر خوشی کے موقع پر ایک رسم ادا کی جاتی تھی۔ رسم ورواج کی یہ ابتداء شاہی درباروں سے شروع ہوئی تھی۔ محلوں سے یہ رسوم امراء کے ساتھ ان کے گھرانوں میں بھی شروع ہوگئے اور پھر عوام نے بھی خوشی خوشی انھیں اپنالیا۔ قبل پیدائش لے کر بالغ ہونے اور مرنے تک کئی رسمیں تھی قدیم زمانے سے جن کی آج تک حیدرآبادی پابندی کرتے آرہے ہیں۔

حیدرآباد کی تہذیب مشترکہ تہذیب ہے۔ اس تہذیب کو قائم رکھنے میں محمد قلی قطب شاہ، وقارالامراء، میر عثمان علی خاں اور مہاراجہ کشن پرشاد شآد نے کوشش کی ہے۔ اس دور سے آج تک اس مشترکہ تہذیب کو قائم رکھنے کی کوشش پابندی سے کررہے ہیں۔ اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ حیدرآبادی تہذیب کی اہم خصوصیت یہ ہے۔ یہاں کے لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔ حیدرآبادی تہذیب کے بارے میں محمد اسحاق لکھتے ہیں:

''وقارالامراء بمبئی کی کسی اونچی ہوٹل میں آکر ٹھہرے ہوئے تھے۔ بمبئی کے قریبی دیہات سے ایک دن صبح ہی گجردم ایک برہمن اس امیر کبیر کے آنے کی خبر سن کر پہنچ گیا۔ نواب صاحب صبح میں لان میں ٹہل رہے تھے عرض کیا حضور میری تین جوان لڑکیاں ہیں اور فلاں دن تینوں کی ایک ساتھ شادیاں ٹھہری ہیں سرکار سے صرف ایک ہزار روپے کی مدد

ہوتو کام چل جائے گا۔ بڑی پریشانی میں پڑ گیا ہوں۔نواب صاحب تفصیلات پوچھتے گئے آخر میں سکریٹری کوحکم دیا کہ تین ہزارروپئے دے دیئے جائیں۔ برہمن اپنے دھرم کا پکا نکلا۔ کہنے لگا حضور گھر سے صرف ایک ہزاررقم کی پرارتھنا کر کے چلا تھا بس اتنی ہی رقم لوں گا۔ادھرنواب صاحب زبردستی کرتے جاتے لیکن برہمن کا انکار بڑھتا ہی گیا۔آخر برہمن ایک ہزار روپے لے کر چلا گیا۔جس دن شادی تھی نواب وقار الامراء موٹر میں اس گاؤں کے لئے روانہ ہوئے۔شادی کے منڈپ میں جا کر ہرلڑکی کوتین ہزار کے کپڑے تین ہزار کا زیوراور تین ہزار نقد دے کرایسا وداع کیا جیسے کوئی باپ اپنی لڑکی کووداع کرتا ہے''[۲۰]

بچہ پیدا ہونے سے مرنے تک کئی رسمیں ہیں۔قبل پیدائش سے لے کر بالغ ہونے تک مختلف رسمیں ہیں جیسے چوماسہ،ستواسہ، بچہ کی پیدائش، چھٹی، چھلّہ، بھانڈے کی رسم، نام رکھائی،عقیقہ، کاجل لگوائی کی رسم، لَٹ دُھلائی کی رسم، جھولے کی رسم، کھیر چٹائی یا بور چٹائی کی رسم، سالگرہ کی رسم تسمیہ کی رسم، چوٹی گوندھائی کی رسم، ناک کان چھدائی کی رسم، ختنہ کی رسم، دودھ چھُڑائی کی رسم، روزہ رکھائی کی رسم، گودبھرائی یا رسم بلوغت کی رسم وغیرہ وغیرہ۔اس کے علاوہ نذرونیاز بھی بڑے عقیدے سے مناتے ہیں۔جب شادی ہونے کے بعدلڑکی حمل اختیار کرتی ہے تو تب سے رسمیں شروع ہوجاتے ہیں۔حاملہ لڑکی کو گودبھرتے ہیں اس کو گودبھرائی کی رسم بھی کہتے ہیں اور ستواسہ کی رسم بھی کہتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

ستواسہ:

یہ ہندی زبان کا لفظ ہے اور زمانہ حمل کی دوسری رسم کا نام ہے جو ساتواں مہینہ شروع ہونے سے منائی جاتی ہے۔جس میں حاملہ کے لیے اس کے میکے سے سبز جوڑا''مسّی''عطر، پان، پھلیل، کنگھی، جوتی، مہندی، پھولوں کا گہنا، سبز رنگ کی چوڑیاں، چاندنی کی نہرنی، چاند کی

کٹوری اور میٹھا پکا کر بھیجی جاتی ہے۔ اس تقریب میں حاملہ کی گود میوؤں سے بھری جاتی ہے۔اس کو گود بھرائی کی رسم بھی کہتے ہیں'' ۲۱؎

بچہ کی پیدائش:

جب بچہ پیدا ہوتا ہے اس کو نانا یا دادا گود میں لے کر اس کے کان میں اذان دے کر کان میں نام پھونک دیتے ہیں۔ اس کے بعد مدینہ منورہ کی کھجور یا معمولی کھجور یا چھوارے کی قاش پر شہد لگا کر چٹاتے ہیں۔

چھٹی:

بچہ پیدا ہونے کے چھٹے دن ماں کو غسل کرنے کی رسم کو چھٹی کہتے ہیں۔ ماں اور بچہ دونوں کو نہلاتے اور نئے کپڑے پہناتے ہیں۔ میٹھا کھانا پکوا کر فاتحہ دلائی جاتی ہے۔دوست اور رشتہ دار بچہ کے لیے کھلونے چاندی کے برتن مثلاً گلاس، کٹوری کے علاوہ ٹوپی لاتے ہیں۔اور چھٹی کے دن خاص کر کھچڑی پکائی جاتی ہے۔ عقیقہ یا منڈن کی رسم ادا کی جاتی ہے اس رسم کے بارے میں اقبال جہاں قدیر لکھتی ہیں:

> ''عقیقہ یا منڈن: عقیقہ مسلمانوں کی مذہبی رسم ہے۔ عام طور پر مسلمانوں کے پاس عقیقہ کی رسم گھر پر ہی ہوتی ہے۔ بچی ہو تو ایک بکرا اور بچہ ہو تو دو بکرے ذبح کیا جاتا ہے۔ اکثر حیدرآبادی ہندو لوگ جہانگیر پیراں کی درگاہ کو جا کر بچے کے بال نکالتے ہیں اور نیاز کرتے ہیں۔ یا پھر حضرت بابا شرف الدین صاحبؒ کی نیازی کو جا کر نیاز کر کے بال نکالتے ہیں۔اکثر دیہاتی مسلمان بھی اسی طرح سے بچوں کے بال نکلواتے ہیں'' ۲۲؎

چھلّہ:

یہ رسم بھی حیدرآبادی اہم سمجھتے ہیں جب بچہ چالیس دن کا ہو جاتا ہے تو اس دن ماں اور بچہ کو غسل

دے کر نہلایا جاتا ہے۔اور پانچ یا سات سہاگنیں دو دو بار دو دو لوٹے پانی ڈالتی ہیں۔اور لوٹے کے منہ پر لال دھاگا باندھ دیتے ہیں۔

سالگرہ:

سالگرہ کی رسم بھی حیدرآباد میں بڑے چاؤ سے منائی جاتی تھی۔قطب شاہی اور آصف جاہی دور میں سالگرہ کا جشن بہت دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر روپیہ، اشرفی بانٹے جاتے تھے۔ سالگرہ کے دن بچے کے پاؤں میں چاندی یا سونے کا کڑا پہنایا جاتا ہے اور بچے کی گردن میں ہنسلی پہنائی جاتی ہے۔بچہ کی گل پوشی کی جاتی ہے۔

تسمیہ:

یہ رسم بھی حیدرآبادیوں کی خاص رسم ہے۔یہ رسم خاص مذہبی ہے۔بچہ کے چار سال چار ماہ چار دن کا ہونے پر منائی جاتی ہے۔بسم اللہ پڑھنے یا لکھنے کو تسمیہ کہتے ہیں۔بچے کو اس دن قیمتی لباس پہناتے ہیں۔اور پھول بھی پہناتے ہیں۔

قرآن خوانی:

بچوں کے قرآن ختم کرنے پر بھی ایک رسم یہ کی جاتی ہے کہ استاد کو دعوت دے کر ان کو نئے کپڑے دئے جاتے ہیں۔اور قرآن شریف کو پڑھایا جاتا ہے۔محلے کے لوگ آ کر سنتے ہیں۔اور سب کو پان اور میٹھا بانٹتے ہیں۔

روزہ رکھائی کی رسم:

جب بچہ نو یا گیارہ سال کا ہو جائے تو بچہ کو سحری کراتے ہیں روزہ رکھواتے ہیں دو روزے رکھوائے جاتے ہیں افطار کے بعد گل پوشی کرتے ہیں۔اور محلے والوں کو پان سیپاری،لڈو،اور مصری بانٹتے ہیں۔

کھیل کود:

کھیل کود بھی حیدرآبادیوں کا خاص مشغلہ تھا۔ قطب شاہی دور اور آصف جاہی دور میں کھیل کود کو بہت اہمیت دی جاتی تھی اور اب بھی ہے۔ حیدرآباد کے کھیل مختلف ہیں جیسے پولو، فٹ بال، کرکٹ، کبڈی شطرنج، ہاکی، ٹینس، تیراکی وغیرہ۔

اس کے علاوہ دیگر میدانی کھیل بھی ہیں جو حسب ذیل ہیں ان میدانی کھیلوں کے نام یہ ہیں۔ بیڈمنٹن، شٹل کاگ، باسکٹ بال، بیس بال، جائنٹ بال، باکسنگ، ٹمبلنگ، ٹینی کائٹ وغیرہ

متفرق کھیل:

متفرق کھیل یہ ہیں: لون پاٹ، چرکی بلّہ، سنارخور، ہنگورچہ، اَغل جھانپ، چوّا، گلی ڈنڈا، جھاڑبند، پتھر پاشا، میاں جانی کی گھوڑی، لٹو، تال بم، بھڑ وچھپ جا، بھڑ واتنا، کونے کی بلّی وغیرہ۔

لڑکیوں کے کھیل:

حیدرآباد کی لڑکیاں بچپن میں یہ کھیل کھیلا کرتی تھیں۔ لڑکیوں کے کھیل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ آنکھ مچولی
۲۔ اپڑی کی تپڑی
۳۔ اندھی پاشاہ
۴۔ ہاپھُوہَر یاپھو
۵۔ اِیرک میرک
۶۔ ہَندگھیا
۷۔ گڑیوں کی شادی
۸۔ چاندنی رات میں سوئی پرونا۔'' ؎۲۳

فنونِ سپہ گری:

حیدرآبادی فنونِ سپہ گری کے دلدادہ تھے۔ قطب شاہی اور آصف جاہی دور میں فنون سپہ گری کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ اس کے کئی اقسام ہیں۔ جیسے بنوٹ، شکار، کُشتی و پہلوانی، پنجہ کشی، گھوڑ دوڑ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ حیدرآبادی فنون لطیفہ کے بھی شوقین تھے۔ ان میں موسیقی، رقص، قوالی، گلوکار اور مختلف ساز اور باجے والے شامل ہیں۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ موسیقی میں ماہر تھا۔ اس نے بہت سے راگ راگنیوں کے لئے بے شمار گیت موزوں کئے تھے۔

رقص:

حیدرآبادی رقص کے بہت شوقین تھے۔ قطب شاہی دور میں تارامتی مشہور رقاصہ تھی اس کے بارے میں یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''قطب شاہی سلطنت کا آخری تاجدار عبدالحسن تاناشاہ کے ہاں بھی عیش وطرب کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ اس کے عہد میں تارامتی اور پیامتی دو رقاصائیں بہت مشہور تھیں۔ جو قلعہ گولکنڈہ کے نواح میں اپنے اپنے عالیشان محلوں میں رہتی تھیں۔ تارامتی کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ وہ چاندنی راتوں میں اپنے محل سے ایک مضبوط رَسّی پر رقص کرتے ہوئے بادشاہ کو مجرا دینے کے لئے قلعہ گولکنڈہ تک جایا کرتی تھیں۔ دکن میں فن موسیقی کی شاہانہ سرپرستیوں کے قصّے سن سن کر تان سین کے خاندان کے کئی افراد بھی یہاں آ کر بس گئے تھے۔'' [۲۴]

اس طرح آصف جاہی دور میں بھی کئی مشہور رقاصہ گزری تھیں۔ میر نظام علی خاں کے دور میں ماہ لقابائی چندا مشہور رقاصہ تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی موسیقار اور رقاصائیں تھیں جو اس فن میں مہارت رکھتے تھے اقتباس ملاحظہ ہو:

''نظام علی خاں کے زمانے میں ماہ لقا بائی چندا کا نام اب بھی حیدرآباد میں مشہور ہے۔ اس نے اپنے کمال فن سے موسیقی میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ ماہ لقا بائی چندا کی بیٹی حسین لقا بائی بھی آسمان موسیقی پر بلا کامل کی طرح جگمگاتی رہی۔ آصف جاہ ثانی کے عہد میں ارسطو جاہ نے بھی دور علم و ادب فنون لطیفہ کی عظیم الشان سرپرستی کی تھی۔ اسی زمانے میں بہت سے موسیقار شمالی ہند سے حیدرآباد آ چکے تھے اور کئی تو بلوائے گئے تھے اور حکومت نے ان کے لئے تنخواہیں بھی مقرر کر دی تھیں۔ اس طرح حیدرآباد موسیقی کا بڑا مرکز بن گیا تھا کئی طوائف، موسیقار، قوال اور گلوکاروں نے اس فن میں بڑی شہرت حاصل کی۔'' ؏۲۵

اس کے علاوہ مصوّری و نقاشی کا فن بھی قدیم فن ہے۔ قدیم دور کے لوگ اپنا مافی الضمیر دوسروں تک پہنچانے کے لئے پتھروں پر لکیریں کھینچتے تھے اور اشکال بناتے تھے۔ یہیں سے نقاشی کی ابتداء ہوئی اور مصوری کی بھی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ان میں تبدیلیاں ہونے لگیں۔ آدمیوں اور جانوروں کی تصویریں بنائی جانے لگیں۔ رنگ اور برش ایجاد ہوئے اور تصاویروں میں رنگ بھرے جانے لگے۔ پتھر تراش، مجسمے بنانے والے بت تراش و سنگ تراش کہلانے لگے اور تصاویر و نقش و نگار بنانے والے مصور و نقاش کہلانے لگے۔ اس کے متعلق ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''میر عثمان علی خاں کے عہد میں حیدرآباد دکن میں ''اسکول آف آرٹ'' کے نام سے جو ادارہ قائم ہوا تھا اس میں مصوری کے علاوہ مجسمہ سازی کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ دکن میں بڑے بڑے مصور و مجسمہ ساز پیدا ہوئے۔ ان مجسمہ سازوں نے انسانی جسم کے اندرونی اعضاء کے ماڈل بنانے میں کافی شہرت حاصل کی تھی۔ سقوط حیدرآباد کے وقت جو مشہور مصور تھے ان میں عبدالقیوم، فضل اللہ اور محمد تراب کے نام سرفہرست ہیں۔'' ؏۲۶

خطاطی:

خطاطی بھی قدیم فن ہے۔ حیدرآبادی اس فن کے دلدادہ تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے علاوہ کئی ادیب اس فن میں مہارت رکھتے تھے۔ سلاطینِ قطب شاہی اور سلاطین آصفیہ نے بھی خطاط کی سر پرستی کی تھی۔ ان میں چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''سید محمد قدرت اللہ الحسینی عنفوان شباب ہی میں دہلی کو خیرآباد کہہ کر اورنگ آباد میں آکر مقیم ہوگئے تھے۔ یہاں مفتی ضیاء یار جنگ نے ان کو میر محبوب علی خاں کی خدمت میں پیش کیا۔ نوازش، شاہانہ کی بدولت قدرت اللہ الحسینی انتخاب رقم غمِ دوراں سے بےفکر ہوکر فن خطاطی کے جوہر دکھانے لگے۔ میر عثمان علی خاں کے دور میں ان کو مسلم الثبوت خطاط کی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ کرنسی نوٹ، کاغذ مہور، ٹکٹ، پوسٹ کارڈ، لفافے کے ڈیزائن اور تحریریں وغیرہ سب انہی کے فن کی رہین منت ہیں۔ عدالت العالیہ، عثمانیہ نمائش گاہ، شفاخانہ عثمانیہ، مسجدِ باغِ عام، خطّہ صالحین، مسجد جودی کے کتباب بھی قدرت اللہ انتخاب کے رقم کے ہی شاہکار ہیں۔'' ۲۷

جامعہ عثمانیہ، امرائے خاندان آصفیہ، محلات شاہی اور عمائدین ملک کے مونوگرامس دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دکن کے سکّہ کا مونوگرام۔ اشرفی کا مونوگرام، اور سرکاری کاغذات کی خاص خاص مہروں کے نمونے امام الدین عتیق ہی کے قلم کا نتیجہ ہیں جس کے صلہ میں آصف جاہ سادس میر محبوب علی خاں نے منصب سے سرفراز فرمایا تھا۔

> ''امام الدین عتیق کے پوتے مظہر الدین مظہر صحیح معنوں میں اپنے دادا کے جانشین تھے۔ انھوں نے 6 سال کی عمر ہی سے جو کھیلنے کودنے کی عمر ہوتی ہے فن خطاطی کی جانب بھرپور توجہ کی اور نوجوانی کے دور میں ہر

ایک خط مثلاً نستعلیق، ثلث، نسخ، ریحان اور شکستہ میں خاص مہارت حاصل کی۔ چنے کی دال پر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سورہ اخلاص معہ اعراب، مونگ کی دال پر کلمہ طیبہ، تِل کی ایک جانب پنجتن پاک کے اسمائے مبارک اوخشخاص کے دانہ پر اللہ اکبر لکھ کر آصف جاہ سابع سے داد تحسین اور صنعتی نمائش حیدرآباد دکن سے امتیازی سند حاصل کی تھی۔''

۲۸

اس کے علاوہ جلد سازی بھی ایک قدیم فن ہے۔عہد عثمانی کے زرّین دور میں حیدرآباد میں اس فن نے بہت ترقی کی تھی۔ یوں تو دکن میں سینکڑوں کارخانے اور ہزاروں جلد ساز تھے لیکن جو شہرت محبوبیہ کارخانہ کو ہوئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوسکی۔ یہ کارخانہ 1925ء میں قائم ہوا تھا۔جس کی بنیاد شیخ محبوب قریشی نے رکھی تھی۔جلد سازی کے بارے میں یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''جلد سازی کو فن تجلید بھی کہتے ہیں۔کتاب کو صحیفہ، جلد سازی کو صحافی اور جلد ساز کو صحاف کہتے ہیں۔اکثر بزرگانِ دین کا پیشہ جلد ساز رہا ہے۔ایک بزرگ تو صحاف ہی کے نام سے مشہور تھے۔جلد سازی اسلامی فن ہے۔اور علم یا کتاب کے ساتھ لازم وملزوم ہے۔کسی بھی کتاب کو کتاب کا نام ہی نہیں دیا جاسکتا جب تک کہ اس کی جلد بندی نہ ہو۔'' ۲۹

اس طرح حیدرآبادی ہرفن مولا تھے۔قطب شاہی دور اور سلاطین آصفیہ کے دور میں ان علوم و فنون کو ترقی ہوتی گئی اور کئی ماہرین ان فنون میں مہارت حاصل کرتے گئے۔ان علم وفنون کے بادشاہ، امرا اور عوام ہر کوئی ان کے دلدادہ تھے۔

آصفی دور میں خطابات:

آصفیہ دور میں امراء ووزراء کو مختلف اور خاص خطابات دئے جاتے تھے۔خاص کر یہ حیدرآباد کے

خطابات ہیں اور یہ کئی شعراء اور اساتذہ کو بھی دئے گئے۔ کچھ یہ ہیں۔

''جنگ'': یہ خطاب پیشہ، قبیلہ و مذہب والوں کو دیا جاتا تھا جیسے عظمت ''جنگ'' سرتاج ''جنگ'' شاہنواز ''جنگ'' مہدی نواز جنگ وغیرہ۔

''ملک'': یہ خطاب بڑے امراء اور حیدرآباد کی اونچی شخصیتوں کو دیا جاتا تھا۔ جیسے فخر الملک، افسر الملک، مختار الملک، شہریار الملک، سردار الملک، سالار الملک، موید الملک اور سید علی شو

ستری کو استاد الملک کا خطاب دیا گیا تھا۔

''دولہ'': یہ خطاب بلند پایہ امراء اور شاہی خاندان کے افراد کو دیا جاتا تھا۔ جیسے بشیر والدولہ، محبوب الدولہ، اقبال الدولہ، صمصام الدولہ، بہادر الدولہ، روشن الدولہ، خود روسائے وقت ناصر الدولہ چوتھے نظام اور افضل الدولہ پانچویں نظام اس خطاب سے مخاطب تھے۔ یہ خطاب صرف اور صرف حیدرآباد کے خاندانی امراء اور شاہی خاندان کے لئے مخصوص تھا۔ باہر کے لوگوں کو نہیں دیا جاتا تھا۔

''امراء'': یہ صرف امرائے پائیگاہ کو دیا جاتا تھا۔ جیسے شمس الامراء، اعظم الامراء، وقار الامراء، نور الامراء وغیرہ۔

''جاہ'': یہ صرف عظیم مرتبے والے امرائے پائیگاہ اور شاہزادوں کے لئے دیا جاتا تھا۔ جیسے آسمان جاہ، اعظم جاہ، اعلی جاہ اور معلیٰ جاہ وغیرہ۔

حیدرآباد کا تمدن:

حیدرآباد کی تمدن کی ترقی میں امراء کا اہم حصّہ رہا ہے۔ یہ امراء آرام وچین کی زندگی بسر کرنے کے ساتھ ساتھ سماجی اور قومی زمہ داری بھی نبھاتے تھے۔ وہ ملک وقوم کا پورا لحاظ رکھتے تھے۔ وہ ملک کی علمی و اخلاقی خدمت کیا کرتے تھے۔ حیدرآباد کا تمدن، کلچر اور تہذیب جو تمام ہندوستان میں ممتاز نظر آتا ہے

انھیں کا رہین منّت ہے۔

امراء دراصل حیدرآباد کی سیاسی اور سماجی زندگی کے دلدادہ تھے۔ یہ تمام سلطنت کا انتظامیہ سنبھالتے تھے۔ادبی محفلیں امراء کے وجود سے گرم ہوتی تھیں اور یہی شمع محفل ہوا کرتے تھے۔اپنی دادودہش سے غریبوں اور بے شمار گھرانوں کو خوش حال کرتے تھے۔ دولت وثروت اور بلند رتبے کے باوجود ان میں غرور نہ تھا۔وہ غریبوں سے ایسے ملتے تھے گویا وہ ان کے خاص دوست تھے۔

شہر حیدرآباد علمی مرکز رہا ہے۔آصف جاہی دور کے اولین علمی مراکز ''مدرسہ فخریہ'' اور ''مطبع شمس الامراء'' تھے۔اس کے علاوہ بہت سے علمی مراکز قائم کئے گئے تھے جن میں مختلف علوم تھے۔جلیل القدر امیر نے انیسویں صدی کے وسط میں دارالترجمہ کی بنیاد رکھی تھی اور ایک صدی پہلے یونیورسٹی کا خاکہ تیار کر دیا تھا۔ ان کے تراجم سے نہ صرف اردو کا دامن بھر گیا تھا بلکہ ملک کا تمام علمی ماحول بدل گیا تھا۔آسمان جاہ نے بھی نہ صرف حیدرآباد میں علم ودانش کی سرپرستی کی بلکہ بیرون حیدرآباد علمی اداروں اور علماء کو نوازا۔حیدرآباد کے امراءعلم وادب سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔آسامان جاہ کے بارے میں پروفیسر عبدالمجید صدیقی لکھتے ہیں۔

> ''علی گڑھ کالج جس کو سرسید نے قائم کیا تھا سرآسمان جاہ کی علم نوازی کا مرہون منّت ہے۔سرآسمان جاہ نے بذات خود علی گڑھ کی تعمیر اورارتقاء میں پوری دلچسپی لی تھی نہ صرف کثیر رقم سے کالج کی مدد کی بلکہ بہ نفس نفیس علی گڑھ جاکر تعلیمی سرگرمیوں کا معائینہ کیا اور اہلِ علم کی حوصلہ افزائی کی۔مولانا فضل حق خیرآبادی اور مولانا حالی جیسے علماء کے لئے وظائف مقرر کئے۔''[۳۰]

اس کے علاوہ حیدرآباد کے بہت سے امراءعلوم وفنون کے دلدادہ تھے وہ علمی کتب خانے قائم کئے سروقارالامراء کے دور میں کتب خانہ آصفیہ مدرسہ انجنیر نگ اور لا کلاس قائم کئے گئے تھےاور سالار جنگ کے چچا سراج الملک نے ایک طبی مدرسہ سلطان بازار میں قائم کیا تھا۔

حیدرآباد کی سیاسی تمدنی،علمی وادبی سرگرمیوں میں آصف جاہی حکمرانوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔آصف جاہی دور کی سب سے نمایاں شخصیت نواب میر محبوب علی خاں کی تھی۔ وہ نہ صرف ایک مکمل

انسان تھے بلکہ شاہی اور مطلق العنان کے دور میں عوام سے بہت قریب رہا کرتے تھے۔نواب میر محبوب علی خاں کو اہلِ حیدرآباد خلوص، پیار اور احترام دیا کرتے تھے۔ان کے دور میں حیدرآبادی شعراء میں سید رضی الدین کیفی، مہاراجہ کشن پرشاد شآد، محمد حیدر خان لقمان الدولہ دلؔ، شمس العماء، احمد عبدالعزیز، عزیز جنگ ولا، مہدی حسن اسم کے نام قابلِ ذکر تھے۔

آصف جاہی حکمران رواجاً رواجاً میت پر پُرسہ کے لئے اور جلوس جنازے میں نہیں آتے تھے۔ لیکن میر محبوب علی خاں نے اس خاندانی رواج کو توڑ دیا وہ نہ صرف جلوس جنازہ میں شریک ہوتے بلکہ کندھا بھی دیا کرتے تھے۔۱۱ محرم سن ۱۹۰۱ء کو حضرت اسمٰعیل شاہ مجذوب کا انتقال ہوا تھا۔ان کی نماز جنازہ مکہ مسجد میں ادا کی گئی تھی تو نواب میر محبوب علی خاں نے مکہ مسجد کے دروازے سے چار مینار تک از راہ عقیدت جنازہ کو کندھا دیا۔شاہ صاحب کی تدفین و تکفین کے لیے خزانہ خاص سے دو ہزار روپیے منظور کیے گئے۔اس کے بعد نواب میر عثمان نے اپنی مسند نشینی کے بعد مہاراجہ کشن پرشاد شآد کو ہی خدمت مدار المہامی پر رکھا۔شآد کو شاہی تقرب حاصل ہو گیا تھا۔مہاراجہ کشن پرشاد شآد پر دوہری ذمہ داریاں عائد ہو گئی تھیں۔یعنی نئے حکمران کے منشا کو ملحوظ رکھنا انگریز حکومت کا اعتماد بھی قائم رکھنا اور ریاست کا نظم و نسق تھا۔ان ذمہ داریوں کے علاوہ طاؤن کا انسداد اور دہلی دربار میں والی ریاست کی شرکت کے لیے ضروری انتظامات بھی کرتے تھے۔دہلی دربار سے واپسی کے بعد جب شاہی سواری نے جب اورنگ آباد میں قیام کیا تو مہاراجہ شہر میں طاعون کی وبا کے انسدادی کاموں کی نگرانی کے سلسلے میں حیدرآباد چلے آئے۔شاہی سواری اورنگ آباد سے ورنگل روانہ ہوئی۔ بادشاہ اور مدار المہام کی دوری سے کچھ ابن الوقت لوگوں کی بن آئی اور انھوں نے سرعت کے ساتھ غلط فہمیاں کا جال بچھا دیا۔پائیگاہوں کے انتظام میں تغیر ہوا۔

مہاراجہ کے دور حکومت میں حیدرآباد کے سیاسی حالات تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ہندوستان کے تقریباً تمام حصوں میں تحریک آزادی عروج پر تھی اور حیدرآباد کی پرسکون زندگی اس جدید طوفان کے اثرات سے بچ نہ سکی۔مہاراجہ نے خود اپنے آپ کو زمانے کے مطابق بنالیا۔انفرادی ذمہ داری کے بجائے اجتماعی ذمہ داری باب حکومت پر عاید ہوگئی تھی۔مجلس بلدیہ کا قیام عمل میں آیا۔حیدرآباد میں سمنیٹ کی سڑکیں بنائی گئیں۔سررشتہ باہمی امداد کی تنظیم کی گئی۔ریلوے لائینوں کی توسیع کی گئی۔ریلوے بس اور فضائی حمل و

نقل کا طریقہ رائج ہوا۔ برار کا نیا معاہدہ ہوا۔ رزیڈنسی کا استرداد عمل میں آیا۔ اوراس علاقہ کو سلطان بازار کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اسٹیٹ بینک کے قیام کی کاروائی کا آغاز کیا گیا۔ گاؤں سدھار تحریک کی سرکاری محکموں کی جانب سے حوصلہ افزائی کی گئی۔ عہدہ صدرالصدور پر کوئی تقرر نہیں کیا گیا اور عہدہ مفتی کو ختم کردیا گیا تھا۔ شروط الخدمت جاگیری مواضعات شریک خالصہ کئے گئے۔ سرکاری ملازمین کے لیے کم سے کم میٹرک کا امتحان پاس ہونا ضروری قرار دیا گیا۔ توشہ خانہ عامرہ اور خیرات و میراث کا تعلق راست پیشی خسروی سے تھا برخواست کر کے محکمہ زر سے متعلق کر دیا گیا۔ سرکاری افواج کی تنظیم جدید کی گئی اور ملازمین کو، بیواؤں اور پسماندگان کے لیے وظیفہ کا طریقہ رائج کیا گیا۔ بڑے منصب داروں کو جو قرضوں کی وجہ سے پریشان تھے خوش حال ہو گئے۔ ایسے اور کئی کارنامے تھے جو مہاراجہ کشن پرشاد شآد کے دور صدارت اعظمی میں انجام دیے گئے تھے۔

نواب میر عثمان علی خاں تقریباً چھ سال بحیثیت راج پرمکھ کارفرما رہے۔ اس دور میں انھوں نے اپنی روایتی مطلق العنانی کی جگہ خود کو ایک دستور پسندہ سربراہ ریاست ثابت کیا۔ اب وزرائے ریاست ان کے آگے جواب دہ نہ تھے بلکہ وہ مجلس مقننہ اور عوام کے آگے جواب دہ تھے۔ ہندوستانی سماج کئی فرقوں اور مذاہب کے ماننے والوں پر مشتمل رہا ہے۔ مذہب اور علاقائی زبانوں نے بہت جلد سیاسی جماعتوں اور قانون ساز اداروں میں اہمیت حاصل کر لی۔ حیدرآباد تین مختلف زبانون یعنی تلگو، مراٹھی اور کنڑی کا سنگم رہا ہے۔ علاقائی زبانوں نے صوبوں کی تشکیل کے بعد اس مشترکہ سہ لسانی ریاست کے ٹکڑے کر دیے گئے اور حیدرآباد کا کم وبیش ہر خاندان ان تین علاقائی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔

قطب شاہی دور اور آصف جاہی دور میں عیدوں، تہواروں، میلے اور عروس اور جاترے بڑے دھوم دھام سے منائے جاتے تھے۔ میر محبوب علی خاں کا دور دکن کی تاریخ کا روشن باب تھا جس میں آپ کی رواداری سے ہندو مسلم اتحاد، بھائی چارگی اور قومی یکجہتی کو تقویت ملی تھی۔ ان کے دور میں عید، تہوار، میلے، عروس جاترے سب ہندو مسلم مل جل کر مناتے تھے۔ یہ حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب تھی۔ عیدوں، تہواروں، میلے عروس اور جاتروں سے تہذیب جلدی پہچانی جاتی ہے یہ سب تہذیب کی نشانیاں ہیں۔ ہر قوم ہر مذہب کے لوگ اپنے مذہبی طور پر عید و تہوار مناتے ہیں۔ مسلمانوں کے تہوار، عیدالفطر، عیدالضحیٰ، رجب کے کونڈے،

عید میلا دالنبی، گیارھویں کی نیاز، عیدنو روز وغیرہ وغیرہ۔ ہندوؤں کے تہوار بسنت پنچمی، مرگ، اگادی، دیپاولی، دسہرہ، تلسنکرات ناگ پنچھمی، ہولی وغیرہ وغیرہ ہیں۔

حیدرآباد میں رمضان کا خاص طور سے اہتمام کیا جاتا ہے۔ حیدرآباد میں عید کا ایک الگ ماحول رہتا ہے۔ ہندو مسلم سب ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''آصفی دور میں اکثر مسجدوں میں تراویح کی نمازیں ہونے لگتیں، مسجدوں میں روشنی کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ مسجدوں میں افطاری بھیجی جاتی تھی۔ عید کی ملاقات کے لیے مسلمان عہدیداروں کے علاوہ ہندو عہدیدار بھی عید کی ملاقات اور مبارک باد دینے کے لیے آتے تھے۔ ''ہمارے بچپن میں اولاً راجا مرلی منوہر صاحب، صدر محاسب، راجا فتح نواز صاحب، مرلی دھر بخشی، رگھناتھ پرشاد صاحب جج ہائی کورٹ اور راجا اندرکرن وغیرہ کے پاس ان کے ماتحت مسلمان عید کی ملاقات کے لیے آتے تھے۔ پان سپاری وغیرہ تقسیم ہوتی تھی۔ تعجب تو اس پر ہوتا تھا کہ ہندو عہدیداروں کے پاس مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ان کے ماتحت ہندو بھی آتے تھے گویا قومی عید ہوتی تھی۔''۳۰

عیدالضحیٰ حیدرآباد میں دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ حیدرآباد میں عیدالضحیٰ کے دن بکرے، اونٹ اور گائے ذبح کر کے قربانی دی جاتی ہے۔ یہاں پر کوئی فساد جھگڑا نہیں ہوتا ہے۔ حیدرآباد کے عوام اتفاق اور یکجہتی سے رہتے ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''حیدرآباد میں عیدالفطر کے دن عموماً بکرے ذبح کیے جاتے تھے۔ اونٹ اور گائے کی قربانی شاذ و نادر ہوتی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ بقرعید کے موقع پر کبھی حیدرآباد یا ملک محروسہ نظام میں کبھی کوئی ہنگامہ اور فساد نہیں ہوا۔ سن 1920ء کے بعد جس طرح ہندوستان کے صوبوں اور اضلاع میں ہنگامے اور فساد بقرعید کے موقع پر ہوا کرتے تھے۔ یہاں

کبھی نہیں ہوئے بلکہ یہاں کی ہندو مسلم رعایا اتفاق اور یک جہتی کا
ثبوت دیا کرتے تھے۔'' ۳۱؎

اس کے علاوہ حیدرآباد میں عید نوروز بھی مناتے ہیں۔اس عید کو محمد قلی قطب شاہ نے منانا شروع کیا تھا۔ یہ مشترکہ تہذیب کا دلدادہ تھا سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتا تھا۔اس عید کے بارے میں اقبال جہاں قدیر لکھتی ہیں:

''عیدنوروز: یہ دراصل ایران سے آئی۔ پارسی اس عید کو مناتے ہیں۔شہر حیدرآباد میں محمد قلی قطب شاہ نے بین القوامی تمدن پیدا کیا تھا اور شہر میں ایسی فضا بنائی تھی کہ سب ہی طبقے کے لوگوں کا اس نے دل موہ لیا تھا۔ اس نے خالص اسلامی عیدوں اور بھی تقریبیں رائج کی تھیں جن میں عید نوروز بھی ایک عید ہے علوم نجوم کے لحاظ سے سمجھا جاتا ہے کہ جب سورج بارہ برسوں کی گردش کرتا ہوا خط مستقیم پر آجاتا ہے تو ایک سال پورا ہوجاتا ہے اور جس روز سورج یا زمین کا ایک چکر ختم ہوکر نیا چکر یا دور شروع ہوتا ہے تو اس کو نوروز کہتے ہیں۔'' ۳۲؎

اس کے علاوہ حیدرآباد میں ہندوؤں کے تہوار بھی بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے ہیں۔ اگادی، دیوالی، دسہرہ، ہولی، جنم اشٹمی، ناگ پنچھمی، سنکرانتی وغیرہ وغیرہ۔؛

اُگادی:

یہ ہندوؤں کا اہم تہوار ہے۔اگادی کے دن سے تلگو سال شروع ہوتا ہے۔اس تہوار میں لوگ نئے کپڑے پہنتے ہیں۔اگادی کے دن یہ لوگ ایک خاص قسم کا شربت بناتے ہیں۔ یہ نیم کا پھول، گڑ، کیری نئ املی، کچّا کھوپرا ڈال کر بنایا جاتا ہے۔مسلمان ان کے گھر جاتے ہیں اور مبارک باد دیتے ہیں۔

دسہرہ:

دسہرہ بھی ہندوؤں کا اہم تہوار ہے۔ دسہرہ کو وجۂ دشمی بھی کہتے ہیں۔ اس تہوار کو دس دن مناتے ہیں۔ دسہرہ کے دن رام لیلائیں یا رام کتھائیں سنائی جاتی ہیں۔ اس دن مندروں اور گھروں میں رام سیتا کے بھجن گائے جاتے ہیں۔

عروس:

شہر حیدرآباد کے کئی عروس مشہور ہیں۔ بابا شرف الدین صاحب کا عرس، کوہ مولا کا عرس، یوسف صاحب کا عرس، میر مومن صاحب کا عرس، میر محمود صاحب کا عرس، برہنہ شاہ کا عرس، اجالا شاہ کا عرس، شاہ خاموش کا عرس، آغا داؤد صاحب کا عرس، میر محمد حسین اور حضرت جہنگیر پیراں کا عرس وغیرہ۔ ان عرس میں ہندو مسلم بلا مذہب وملت کی تفریق شریک ہوتے ہیں اور زیارت کرتے ہیں اور فاتحہ دیتے ہیں۔ یہ مشترکہ تہذیب کی نشانی ہے۔

میلے:

شہر حیدرآباد میں مختلف میلے لگائے جاتے ہیں۔ ان میلوں میں بھی ہندو مسلم سب شریک ہوتے ہیں۔ یہ قومی یکجہتی اور حیدرآبادی تہذیب کی ایک اہم نشانی ہے تاڑبن کا میلہ، عنبر پیٹ کا میلہ، سنکسیر اور مشیر آباد کے میلے اور لنگم پلّی کا میلا وغیرہ اہم ہیں ان میں لنگم پلی کا میلہ بہت مشہور تھا اور اب بھی ہے۔ اور اب بھی یہ میلہ حیدرآباد میں لگایا جاتا ہے۔

اس طرح حیدرآباد میں کئی جاترے بھی ہوا کرتے تھے۔ حیدرآباد کے مشہور جاترے یہ ہیں دیول سیتا رام باغ کی جاترا، دیول جھام سنگھ، دیول الوال کی جاترا وغیرہ یہاں پر جاترے بھی بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ اس میں بھی ہندو مسلم شریک ہوتے ہیں۔ یہ حیدرآبادی مشترکہ تہذیب ہے۔

اس طرح حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب وتمدن میں ایک رکھ رکھاؤ اور سلیقہ تھا۔ نواب میر عثمان علی خاں کے دور میں حکومت کے ہر شعبہ میں ترقی ہوئی ان کے زمانے میں ملک کی سیاسی، سماجی اور معاشی اصلاحات

اور نظم و نسق میں ترقی ہوئی اور ریاست حیدرآباد ترقی کی راہ پر گامزن تھی۔ ان کے دور میں سلطان العلوم کا ملحقہ ادارہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ، عثمانیہ جنرل ہسپتال، عثمانیہ میڈیکل کالج، صدر شفاخانہ، یونانی مدرسہ، عدالت العالیہ، سٹی کالج، کتب خانہ آصفیہ، معظم جاہی مارکٹ وغیرہ وغیرہ بنائے گئے تھے۔ ہندو مسلم امیر غریب سب ان میں شریک ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ باب حکومت کا مقام، نئی کابینہ کی تشکیل، نظام عثمان ساگر، فتح نگر، پوجارام کا تالاب، میر عالم کا تلاب، زراعت کی ترقی، کسانوں کو لگان کی معافی، جنگلوں کا تحفظ، آبکاری کا انتظام، جاگیرات کی اصلاح اور تعلقات میں دفتروں، مدرسوں، دواخانوں، مسافر خانوں اور سینکڑوں عمارتوں کی تعمیر ملک بھر میں سڑکوں کا جال، چھوٹی بڑی پٹریوں پر پُل، ریلوے کی توسیع، صنعت و حرفت کی ترقی، اسٹیٹ بینک، کوآپریٹیو بینک کا قیام، کرنسی نوٹوں کا رواج، عثمان شاہی ملز شاہ آباد، سمنٹ فیکٹری، بودھن شُگر فیکٹری، سری پور پیپر ملز، سینکڑوں آیل ملز چاول (رائس) ملز اور آرائش بلدیہ وغیرہ میر عثمان علی خاں کی رفاہِ عام کے کام تھے۔ جو اب بھی حیدرآباد میں محفوظ ہیں۔ میر عثمان علی خاں مشترکہ تہذیب کا ایک اہم نمونہ تھے۔ انھوں نے شہر حیدرآباد میں قومی یکجہتی اور باہمی اتحاد کو برقرار رکھا۔ ہند اور مسلم حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب کی دو آنکھیں تھیں۔ شہر حیدرآباد میں مختلف زبانوں کے لوگ آتے گئے اور بستے گئے۔ یہاں کئی زبانیں پروان چڑھیں۔ یہاں ہر قسم کے لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔ اس طرح حیدرآباد شہر مشترکہ تہذیب کا ایک اہم نمونہ بن گیا ہے۔ ایک دوسرے کے خیالات اور عقیدے کا احترام کرتے تھے اور تہواروں میں ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں۔ حیدرآباد شہر مشترکہ تہذیب اور طرز معاشرت کا گہوارہ رہا ہے۔

حوالے:

۱۔ بحوالہ، میر عالم۔۔۔باورچی خانہ، تمکین کاظمی، ص:25

۲۔ دکنی کلچر، نصیر الدین ہاشمی، 1963، ص:344-343

۳۔ ایضاً، ص:347

۴۔ حیدرآباد ماضی کے جھروکوں میں (ممتاز عالموں، ادیبوں، شاعروں، سیاست دانوں اور سیاحوں کے

قلم سے)، خواجہ معین الدین عزمی، ص:218-217 ،2005ء

۵۔ ایضاً، ص:219

۶۔ ایضاً، ص:219

۷۔ تعلیم ایک تحریک اور متفرق مضامین محمد اسحاق، ص:116، 2003ء

۸۔ مسلم ہند کے علمی، فکری، سیاسی، اور ثقافتی ارتقاء میں حیدرآباد دکن کا کردار از ولی الدین قریشی،

مضمون، مشمولہ، محمد عظیم الدین 1978، ص:386-383

۹۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی زندگی کے حالات، از مہدی نواز جنگ 1900ء، ص:91

۱۰۔ تعلیم تحریک اور متفرق مضامین، محمد اسحاق، 2003ء، ص:116

۱۱۔ دکنی کلچر، نصیر الدین ہاشمی، 1963ء، ص:266-265

۱۲۔ ایضاً، ص:272

۱۳۔ تعلیم ایک تحریک اور متفرق مضامین محمد اسحاق، 2003ء، ص:118

۱۴۔ تذکرہ معاشرت حیدرآباد دکن از ابوظفر موئید الدین، ص:243

۱۵۔ محمد عظیم الدین ''زیورات'' مشمولہ ''مسلم ہند کے علمی، فکری، سیاسی اور ثقافتی ارتقاء میں حیدرآباد کا دکن کا کردار'' ولی الدین قریشی، 1978ء، ص: 356-358

۱۶۔ ایضاً، ص: 397

۱۷۔ ایضاً، ص: 397-398

۱۸۔ حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب، اقبال جہاں قدیر، 1985، ص: 63-64

۱۹۔ حیدرآباد کبھی ایسا بھی تھا، تمکین کاظمی، ص: 44

۲۰۔ تعلیم ایک تحریک اور متفرق مضامین، محمد اسحاق، ص: 116، 2003ء۔

۲۱۔ محمد عظیم الدین ''زیورات'' مشمولہ ''مسلم ہند کے علمی، فکری، سیاسی اور ثقافتی ارتقاء میں حیدرآباد کا دکن کا کردار'' ولی الدین قریشی، 1978، ص: 404، 1978

۲۲۔ حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب، اقبال جہاں قدیر، ص: 84، 1985ء

۲۳۔ مسلم ہند کے علمی، فکری، سیاسی اور ثقافتی ارتقاء میں حیدرآباد دکن کا کردار، ولی الدین، ص: 423 1978ء

۲۴۔ ایضاً، ص: 425

۲۵۔ ایضاً، ص: 431

۲۶۔ مسلم ہند کے علمی، فکری، سیاسی اور ثقافتی ارتقاء میں حیدرآباد دکن کا کردار، ولی الدین قریشی، ص: 437 (مضمون مشمولہ، محمد عظیم الدین محبت) 1978ء

۲۷۔ ایضاً، ص: 438

۲۸۔ ایضاً، ص: 438

۲۹۔ ایضاً، ص: 440

۳۰۔ دکنی کلچر، نصیر الدین ہاشمی، ص: 369-377، 1963ء

۳۱۔ ایضاً، ص: 378-379

۳۲۔ حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب، اقبال جہاں قدیر، ص: 139-140، 1985ء۔

بابِ سوم

کشن پرشاد شآد کے ناولوں کا اجمالی جائزہ

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی، نظم، نثر، سفرنامے، خطوط، متفرقات کے علاوہ ناول بھی لکھے ہیں۔ شاؔد نے تقریباً 100 سے زیادہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ کشن پرشاد شاؔد میر محبوب علی خاں اور عثمان علی خاں کے دور حکومت میں 22 سال تک مدارالمہام اور وزرائے اعظم کے عہدوں پر فائز رہے۔ ان کو اردو ادب سے خاص دلچسپی تھی اسی دلچسپی کی بدولت انھوں نے متعدد کتابیں اور ناول بھی لکھے۔ سیاسی مصروفیات کی وجہ سے وہ کسی ایک صنف میں اپنا قدم نہیں جما پائے بلکہ ان کی شناخت ایک اچھے شاعر کی بھی ہے۔ ان کے کئی اردو اور فارسی کے شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ وہ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ ان کے دربار میں متعدد شعراء موجود رہتے تھے۔

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد حیدرآباد کے پہلے ناول نگار تھے۔ انھوں حیدرآباد میں اردو ناول کی بنیاد ڈالی۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناولوں سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ خاص کر ’فسانۂ آزاد‘ کو بہت شوق سے پڑھتے تھے۔ فسانہ آزاد اس وقت قسط وار اودھ اخبار میں چھپتا تھا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار مہاراجہ کے دربار میں ایک اچھے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے تھے۔ کشن پرشاد سرشار کو عزیز رکھتے تھے اور ان کو اپنا کلام نظم و نثر دکھاتے تھے اور ان سے اصلاح کرا لیتے تھے۔ کشن پرشاد شاؔد نے سرشار کے ناول لکھنے کے اسلوب کو اپنانے کی کوشش کی اور اسی طرز میں ناول لکھے۔ ان کے ناول یہ ہیں۔

۱۔ سرمایۂ سعادت 1887ء یہ مختصر سا قصّہ ہے۔

۲۔ مطلع خورشید 1897ء

۳۔ چنچل نار 1903ء

۴۔ بزمِ خیال (یہ تین حصوں پر مشتمل ہے) 1909ء

۵۔ فسانۂ شیدا۔

فسانۂ شیدا دستیاب نہیں ہے۔ اس ناول کا ذکر ڈاکٹر حبیب ضیاء نے اپنی کتاب ’’مہاراجہ سر کشن

پرشادشاؔدحیات اورادبی خدمات‘‘ میں کیا ہے۔لیکن انھیں بھی یہ ناول کہیں نہیں ملا اور مہاراجہ کے دور میں بھی یہ شائع نہیں ہوئی۔اس کے بارے میں خود مہاراجہ لکھتے ہیں:

’’سن ۱۳۱۶ھ میں سرشار کی ترغیب سے میں نے ’’مطلع خورشید‘‘ کے نام سے ایک ناول لکھا اور سرشار کی نظر ثانی کے بعد طبع اور شائع کرایا گیا۔’’فسانۂ شیدا‘‘ بھی نامکمل تھا اور ابھی ان کے نظر اصلاح کے منظور نہیں ہوا۔لہذا اسی کے طبع کا موقع نہیں آیا‘‘ [۱]

کشن پرشادشاؔد نے اپنے ناولوں میں معاشرتی زندگی کی تصویر کھینچی ہے۔ان کے ناول اخلاقی ہیں۔انھوں نے حسن وعشق کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔1857ء کے غدر کے بعد یہ اردو میں ناول لکھنے کا رواج ہوا۔معاشرہ میں سب سے پہلے اصلاح کے لئے تعلیمی،مذہبی،اخلاقی،نفسیاتی،رومانی اور تاریخی ناول لکھے گئے۔کشن پرشاد نے بھی ناول کی صنف سے متاثر ہوکر تین ناول لکھے۔ایک کہانی بھی لکھی۔ جب ان کے ناولوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں ناول لکھنے کی صلاحیت موجود تھی۔میرے خیال سے ان کے ناول اس دور میں منظر عام پر نہیں آئے۔اور آئے بھی ہیں تو مصنفوں اور ادیبوں کے نظروں سے نہیں گزرے ہوں گے۔صرف ایک ناول ’’چنچل نار‘‘ کا ہی چرچہ اور ذکر چند مصنفوں نے کیا ہے۔اس کی تفصیل ناول چنچل نار میں آئے گی۔

سرمایۂ سعادت

’’سرمایۂ سعادت‘‘ مہاراجہ کشن پرشادشاؔد کی پہلی کہانی ہے۔اس کو 1887ء میں لکھا گیا۔یہ ناول دارالطبع فنون میں منظر عام پر آیا۔یہ ایک اصلاحی کہانی ہے۔اس کہانی میں دراصل شاؔد نے نصیحت کی ہے۔ فریس اور شریف دو بھائیوں کا قصہ ہے۔فریس اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔یہ ناول نہیں ہے بلکہ ایک مختصر سا قصہ ہے۔اس میں انھوں ے قصہ در قصہ تکنیک کو استعمال کیا ہے۔فریس اور قمر النساء مثبت کردار ہیں۔ ہیں اور منفی کردار شریف اور دلا ور بیگ برائیوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔وہ مصیبتوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ بعد میں ان میں تبدیلی آتی ہے۔اس کا پلاٹ سیدھا اور سادہ ہے۔اس کے علاوہ مہاراجہ کشن پرشادشاؔد نے

خط کی تکنیک کو بھی استعمال کیا ہے۔فریس اپنے بھائی اور بھابھی ماں کو ایک خط لکھتا ہے۔ خط کا اسلوب شیریں انداز میں ہے۔

''سرمایہ سعادت''، کہانی کی پہلی کتاب ہے۔ جسے انہوں نے لکھنے کی کوشش کی ہے۔اس کے بارے میں مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد لکھتے ہیں:

> ''یہ پہلی ہی کتاب ہے جو میں اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں چھپوا کر ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ یہ ایک چھوٹا سا نسخہ ہے جس میں نہ عبارت آرائی ہے نہ زیادہ اشعار درج ہیں۔''۲

اس کہانی میں انھوں نے اولاد کے لئے والدین کتنے فکرمند رہتے ہیں۔اس کو اچھی طرح سے پیش کیا ہے۔خاص کر ماں اپنے بچوں کے لئے بہت پریشان رہتی ہے۔اس کہانی میں انھوں نے یہ نصیحت کی ہے کہ اپنے والدین سے خوش رہنا چاہئے۔ بھائی بہنوں سے مل جل کر رہنا چاہئے۔سب کے ساتھ محبت و دوستی سے پیش آنا چاہئے۔مل جل کر رہنے سے کسی بھی مشکل کو آسان کر سکتے ہیں اور اکیلے رہنے سے مصیبتوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔کشن پرشاد لکھتے ہیں:

> ''جب تک شریف اور فریس اتفاق سے رہے آرام سے گزری۔جبکہ بد معاشوں کی محبت کا اثر ہوا۔اور ان کے کہنے پر شریف اپنے عزیز بھائی سے جدا ہو گیا۔دو مہینے کے عرصے میں پانچ سو روپئے کا قرض دار ہوا۔ ایسی بد حالت ہوئی اور اس قدر تباہ ہوا کہ نہایت شرمندہ ہوا۔ یہاں تک کہ قرض خواہوں نے سرکار میں دعوی کر کے وارنٹ جاری کیا۔ اور مکان وغیرہ نیلام ہو کر کچھ قرضہ ادا ہوا۔ باقی جو کچھ رہا سہا تھا۔اس میں تنخواہ واضع ہونے کا حکم ہوا۔''۳

''سرمایہ سعادت''میں فریس کا کردار نہایت مہذب کردار ہے۔اس کے اخلاق و کردار سے اس کی تہذیب معلوم ہوتی ہے۔ وہ پڑھ لکھ کر سماج میں ایک اچھا مقام حاصل کر کر لیتا ہے۔ وہ اپنے فرائض اچھی طرح سے نبھاتا ہے۔مگر اس کا بڑا بھائی شریف نہایت ہی حریف ہے۔ یہ اسکول جا کر تختی اور کتابیں علحیدہ

رکھ دیتا اور اپنے کرا پنے ہم عصر لڑکوں کے ساتھ گولیاں اور لٹھو کھیلتا ہے۔فریس عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود اپنے بڑے بھائی کی شادی کروا فکر کر کے اس کی شادی کروا دیتا ہے۔شریف اپنے چھوٹے بھائی فریس سے بہت فائدہ اٹھاتا ہے۔اس کے ذمیں جو آتا ہے وہ اس کو کرتا ہے اور مفت میں مزے لوٹتا ہے۔محنت سے دور رہتا ہے اور عیاشی کی زندگی گذارتا ہے۔شریف نشے میں چور رنڈی کے مکان پر پہنچ کر یہ دیکھتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کے ہم آغوش میں ہے۔ غصّہ میں آ کر دونوں کو زخمی کر دیتا ہے۔رنڈی چیخیں مارتی ہے سب لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔

ادھر غوث خاں کی دونوں نواسیاں خیر النساء اور شرف النساء پڑھنے لکھنے میں ہوشیار تھیں۔ان کے ماں باپ نہیں تھے۔صرف نانا اور چاچا تھے۔خیر النساء بڑی لڑکی تھی وہ لڑکیوں کو پڑھاتی تھی۔اس کی شادی شریف سے ہو جاتی ہے۔فریس تجارت کے سلسلے میں کلکتہ جاتا ہے اور وہ وہاں ایک ہوٹل میں ٹھہرتا ہے۔ اس ناول میں کشن پرشاد نے ایک حادثاتی واقعہ کو بیان کیا ہے۔فریس جس ہوٹل میں ٹھہرتا ہے اس ہوٹل میں آگ لگ جاتی ہے۔جس وقت ہوٹل میں آگ لگتی ہے فریس اس وقت ہوٹل سے باہر تھا۔اس کے علاوہ ناول میں کشن پرشاد نے ایک قصّہ کو بھی بیان کیا ہے۔ یہ قصہ اس ناول میں بہت دلچسپ ہے۔دلاور بیگ اور قمر النساء نامی دو بھائی بہن رہتے ہیں چند پیسوں کے لئے دلاور بیگ دوستوں کے سکھلانے پر اپنی بہن قمر النساء کو دھوکے سے زہر دے دیتا ہے اور وہ اپنی جان کھو بیٹھتی ہے۔وہ اپنی بہن کو زہر کیوں دیتا ہے اس طرح سے اس ناول کو پڑھتے وقت قاری کا تجسّس بڑھتا جاتا ہے۔یہ ایک سادہ سا قصہ ہے۔

کشن پرشاد سرمایہ سعادت میں شادی کے رسم و رواج کو بھی بیان کیا ہے۔جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کیا رسم و رواج ہوتے ہیں۔اس کو بھی بیان کیا ہے۔مہاراجہ کشن پرشاد نے سرمایہ سعادت میں خطوط کی تکنیک کو بھی استعمال کیا ہے۔فریس آگ کے حادثہ کے بارے میں اپنے بھائی اور بھابھی ماں کو پورا واقعہ لکھ کر بھیجتا ہے۔اس کے بعد فریس اپنے گھر آ جاتا ہے اور سب مل جل کر اتفاق سے زندگی گذارتے ہیں۔

''سرمایہ سعادت'' کا اختتام کشن پرشاد نے طربیہ انداز میں کیا ہے۔اس کا پلاٹ سیدھا سادہ ہے۔رئیس اور قمر النساء متاثر کن کردار ہیں۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سے نبھاتے ہیں۔حالانکہ دونون اپنے بھائیوں سے عمر میں چھوٹے ہیں۔یہ مہذب اور عقل مند ہیں۔اس ناول میں کرداروں کی داخلی

اور خارجی کیفیات اوراس کی اچھائیوں اور برائیوں کا ذکر کیا ہے۔اور بتایا گی ہے کہ نفاق اور اتفاق سے رہنے سے کس طرح مشکلات کو دور کیا جا تا ہے۔ اس کے علاوہ کرداروں کے جذبات،احساسات وخیالات کو بھی بیان کیا ہے۔فریس کا کردار واقعات، حادثات اور ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور اپنے اخلاق سے دوسروں کو بھی متاثر کرتا ہے۔قمر النساء کے کردار میں زندگی کی حرارت،قوت عمل اور زندگی کو بہتر بنانے کا جذبہ موجود رہتا ہے۔ یہ کردار قاری کے دل پر اپنا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔اس کے مکالمے فطری، برجستہ، بر محل، دلچسپ اور پُر اثر ہیں۔اس کے مکالمے روزمرہ کی زبان میں ہیں۔

کشن پرشاد شآد نے اپنے ناولوں کو مختلف حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ایک حصّہ دوسرے حصّہ سے ملتا جلتا ہے۔ایک قصّہ دوسرے قصّہ سے مربوط رہتا ہے۔انھوں نے اپنے ناولوں میں مکالموں میں جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ شیریں اور لاجواب ہیں۔ بے ہنسی مذاق،غم وخوشی، رونا، رولانا، چھیڑ چھاڑ، وغیرہ۔ انھوں نے اپنے تمام ناول سماجی اصلاح کے لئے لکھے ہیں۔مگر اس میں کچھ حد تک ہی کامیاب ہوئے۔شآد کے ناول اخلاقی معیار میں زیادہ بلند نہیں ہیں۔

مطلع خورشید

کشن پرشاد نے ناول ''مطلع خورشید'' 1897ء میں لکھا۔اس ناول میں مختلف ادیبوں کے تاریخی قطعات بھی ہیں۔تاریخی قطعات سے ناول کی تاریخ نکلتی ہے۔ یہ ناول محبوب پریس علاقہ پیشکاری میں طبع ہوا۔اس ناول پر سب سے پہلے داؔغ دہلوی کا تاریخی قطعہ ہے۔

اس ناول میں مہاراجہ کشن پرشاد شآد نے ایک مسلم گھرانے کی تہذیب کو پیش کیا ہے۔ یہ ایک رومانی ناول ہے۔اس ناول میں عشق و عاشقی کو بھی بیان کیا ہے۔اس ناول کی ہیروئن خورشید آرا اور ہیرو مرزا مخمور ہے۔ زینت اور پیاری خورشید آرا کی بہنیں ہیں اوراس کے راز دار بھی۔ مہتاب خورشید آرا کی خادمہ ہے۔انجانے طور پر خورشید آرا کی نظر مرزا مخمور پر پڑتی ہے۔اس کے بعد سے وہ مخمور سے ملنے کے لئے بے چین رہتی ہے۔خورشید آرا ایک مہذب اور پردہ نشین خاتون ہے۔اس دور میں غیر مردوں سے باتیں کرنا اس کے گھر میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔اس ناول کا موضوع حسن وعشق ہے۔اوراس ناول کا مقصد معاشرتی

اصلاح ہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد شآد ناول لکھنے کا شوق رکھتے تھے۔انھوں نے ناول لکھنے کا اسلوب پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناول ''فسانۂ آزاد'' سے لیا ہے۔اور انھوں نے تمام ناول ''فسانۂ آزاد'' کو سامنے رکھ کر لکھے ہیں۔فسانۂ آزاد کے کرداروں کے نام، بیگماتی زبان، محاورے، مثالیں اور ضرب الامثال کو بھی انھوں نے اپنے ناولوں میں استعمال کیا ہے۔کشن پرشاد نے اس ناول میں جگہ جگہ اردو اور فارسی اشعار کو بھی پیش کیا ہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد شآد کے تخلیقی اظہار کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ فطرت اور کائنات سے ان کی گہری وابستگی ہے جو ان کے فن کو عظمت عطا کرتی ہے۔کشن پرشاد کی کہانی میں حقیقت بیانی ہے۔ناول کے مرکزی کردار خورشید آرا اور مرزا مخمور ہیں۔شآد نے اس ناول میں انسانی فطرت کو بیان کیا ہے۔کردار نگاری کے اعتبار سے بھی یہ ناول اہم ہے۔ان کرداروں میں دو مرکزی کردار ہیں اس کے علاوہ ضمنی کردار بھی ہیں جو قصّہ کو آگے بڑھانے میں مدد کرتے ہیں۔خورشید آرا، زینت اور پیاری اپنی جگہ پر اہم کردار ہیں۔

مہاراجہ کشن پرشاد شآد نے اس ناول میں تین بہنوں کا بھی ذکر کیا ہے۔یہ تین بہنیں مل جل کر رہتی ہیں ایک دوسرے سے مذاقبھی کرتی ہیں اور ایک دوسرے کو سہیلی مانتی ہیں۔ایک دوسرے کو چھیڑتی بھی ہیں۔بڑی بہن خورشید آرا کو اس کی دونوں چھوٹی بہنیں اس طرح چھیڑتی ہیں ناول کا یہ اقتباس لاحظہ ہو:

> ''پیاری بیگم نوجوان کوئی سترہ سال کی عمر نازک اندام گلفام، رسیلی آنکھیں، قیمتی لباس پہنے ہوئے جواہرات جڑے ہوئے بعد کرشمہ و ناز اٹھلاتی ہوئی ہر قدم پر فتنہ بپا کرتی ادھر آئیں۔
>
> خورشید آرا: کیوں بہن آج تم نے مجھے نام لے کر پکارا۔کیا مرتبہ بزرگی کا یہی ہے۔
>
> پیاری بیگم: سلام کر کے ہنستی ہوئی بڑی تم کیسی ہو میں بڑی ہوں۔
>
> زینت النساء: واہ واہ خوب کہی اے لو میں سب سے بڑی پھر

دونوں اپنے آپ کو بڑی کہتی ہیں

خورشید: ہاں بیوی تم ہی بڑی ہو۔ہم تمہارے روبرو کی
چھوکریاں ہیں۔

زینت: کیا شک ہے میں نے تمہیں گودوں کھلایا ہے۔

خورشید: بس بس اس وقت مزاج بدمزہ ہے نہ سرپکا

پیاربیگم: کیوں خیریت تو ہے۔اب رنگ لائی گلہری۔

خورشید: اب تو بہت بڑھ کر باتیں بنانے لگیں۔ابھی سے
پاؤں سے پیٹ نکالے

زینت: ای باجی جان ہوش کی باتیں کیجئے پیٹ سے پاؤں
نکالے کہ پاؤں سے پیٹ نکالے''[۴۲]

مکالمہ نگاری کے اعتبار سے بھی یہ ناول کامیاب ہے۔اس میں جو مکالمے ہیں وہ کہیں کہیں بہت طویل ہوگئے ہیں اور کہیں مختصر۔ ان کو پڑھنے کے بعد کہیں بھی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔بعض جگہوں پر مکالمے معنی خیز بھی ہیں۔کشن پرشاد نے کرداروں کے مکالموں کو جس طرح سے ادا کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا زندگی کا تجربہ اور مشاہدہ کافی گہرا ہے۔پڑھے لکھے کرداروں کے زریعہ ادبی اور عالمانہ مکالمے ادا کرائے ہیں اور جاہل کرداروں کے ذریعہ ان کی زبان پر علاقائی اثرات نظر آتے ہیں۔کشن پرشاد شآد کا اسلوب سادگی سے بھرا ہوا ہے۔زبان پر ان کو عبور حاصل ہے۔اس ناول میں انھوں نے سادہ اور سلیس اور شریف گھرانوں کی زبان کو استعمال کیا ہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد شآد نے ناول 'مطلع خورشید میں بیگماتی زبان کو بھی استعمال کیا ہے۔بڑی بیگم جو خورشید آرا کی والدہ تھیں سرکار کہلاتی تھیں۔وہ اپنی لونڈی کو ڈانٹتی ہیں اور ڈانٹ میں محاوروں کو اس طرح استعمال کیا ہے اقتباس ملاحظہ ہو:

''سرکار (بڑی بیگم) لڑکیوں یہ مہتاب نے اس وقت کیا بے ادبی کی تھی۔ کیوں ری لونڈی بچی اتنا دم و داعیہ تجھ کو ہوا کہ ہماری

صاحبزادیوں شہزادیوں سے برابری کا دعوی کرے۔ مینڈ کی چلی مدار کو سچ کہتے ہیں غلام بے وفا ہوتا ہے۔ اور لونڈی سے ہمیشہ آدمی دھوکا کھاہی جاتا ہے۔ قحط میں مول لیا پالا پروسا۔ بچوں کی طرح اتنا بڑا کیا۔ کیا اسی واسطے سر شام سے لمبی تان کے سو رہنا۔ کیا معنی ابھی چراغ میں بتی بھی نہیں پڑی اور یہ سو رہی کوئی بیگم ہے۔ صدقے کیا تھا بیگموں کی ایڑی چوٹی پر تم آرام کرو اور ہمارے بچے صاحبزادیاں اوٹھ اوٹھ کر نکٹّی کو ہکائیں۔ کوآ ہنکی کہیں کی مردار کیا جانے۔ یہ اپنے سسرال میں کیون کر رہے گی۔''۵

کشن پرشاد اپنے ناولوں میں جذبات کے اتار چڑھاؤ کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ انسانی فطرت کو بہترین طریقہ سے پیش کرتے ہیں۔ وہ سماج کے مختلف پہلوؤں اور رنگوں کو مختلف طبقوں کے کرداروں کے ذریعہ پیش کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ ہر کردار اپنے طبقے کی پوری نمائندگی کرتا ہے۔ خورشید آرا کی نظر اچانک نواب پر پڑتی ہے۔ وہ عشق میں مبتلا ہو جاتی ہے اور محبت کر بیٹھتی ہے۔ وہ بے چین اور بے قرار رہنے لگتی ہے۔ کشن پرشاد نے اس ناول میں جگہ جگہ اردو اور فارسی اشعار کو بھی استعمال کیا ہے خورشید آرا کس طرح بے چین ہے ناول کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''خورشید: ہائے کیا کہوں نگوڑی ماری چھت پر گئی ہی کیوں تھی۔ میری قسمت میں یہ دکھ بدا تھا۔ اے ہی اوپر جانا تھا جان کا کال ہوگیا۔ خدا جانے وہ کونسی بری گھڑی تھی کسی کی پیاری پیاری حسرت کی نظر میرے دل میں کُھپ گئی۔ یہ کہہ کر زار زار رونا شروع کر دیا۔''۶

ترا کیا کام اس دل میں غمِ جانا نہ آتا ہے
نکل اے صبر اس گھر سے کہ صاحب خانہ آتا ہے

پیاری اور زینت کے بار بار پوچھنے پر خورشید آرا یوں کہتی ہے

''خورشید مورت اور سیرت مزاج امیرانہ، انداز دلربانہ،ضرور وہ یہی کے ہیں مجھے یقین کلی ہے۔ ہائے بغلی گھونسا جان کا دشمن ہے۔قاتل بے رحم، جفا کار،ستمگار کے ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔من مصنف

بتوں کے عشق میں ہم جان زار کھو بیٹھے'' ے

عجب امانت پر وردگار کھو بیٹھے

اس ناول میں میاں کبڑے کا کردار مزیدار اور پر لطف ہے۔نواب مرزا مخمور اس ناول کے ہیرو ہیں۔مرزا فرخ اور میاں کبڑے ان کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں۔میان کبڑے اس لئے مشہور تھے کہ ماں کے پیٹ ہی سے کمر خمیدہ دنیا کی سیر کرنے تشریف لائے تھے۔ان کی عمر پچاس سال کی ہے۔اس ناول میں میاں کبڑے کا کردار اہم ہے کبڑے کے بارے میں شآد لکھتے ہیں:

''میاں کبڑے قوم کے خان تری پٹھان۔نیکلی پگڑی بر سری انگرکھا اور نیم آستین دربر اور ایک پرانی تلوار بغل میں چڑھائے جوتا پاؤں میں مزاج کے تیکھے اور خوش مزاج ایسے کہ روتے ہوئے کو ہنسانا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔''۸؎

نوابوں کے درباروں میں شاعروں کو اشرفیاں دی جاتی تھیں۔ یہاں نواب مخمور کے دربار میں بھی اشرفیاں دی جاتی تھیں۔میاں کبڑے ہمیشہ اشرفیاں لینے کے لئے تیار رہتے تھے۔کشن پرشاد نے میاں کبڑے کے کردار سے فارسی میں مکالمے ادا کرائے ہیں اور فارسی الفاظ بیان کو استعمال کیا ہے۔ان کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔میاں کبڑے کی زبان کے فارسی الفاظ یوں ہیں:

''میاں کبڑے: نانا۔نانا۔حضور نانا۔اردو زبان مادر من کہ زوجہ مکرمۂ پدر بزرگ من بوندے، ہندوستانی بنودن حی شود، ایرانی می شود،شما یہ بیند کہ گال اودرین اوقا تہائے پیری اس قدر لال بھبوکا است کہ از بوٹ تری استر شما بہتر وسرخ تر می شود۔ نام زوجۂ من، نانا غلط گفتم، نام زوجۂ پدر مال بیر بھبوٹی ست) آن والدہ من است نہ زوجۂ من کہ از غلط گفتم۔''۹؎

اس ناول میں پلاٹ، کہانی، منظر نگاری اور جذبات نگاری کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے۔ ان کے مکالمے برجستہ ہیں۔ خورشید آرا کو نواب مخمور سے عشق ہو جاتا ہے۔ وہ عشق میں بے چین رہتی ہے۔ خورشید آرا کی عشق کی داستان کیسے آگے بڑھتی ہے اور کیا ہوتا ہے؟ اس طرح کا تجسّس برقرار رکھتے ہوئے ناول کو آگے بڑھاتے ہیں۔ فیضن، روشن، فرخ مرزا اور میاں کبڑے نواب کے دربار میں شریک رہتے ہیں۔ ادھر نواب صاحب بھی خورشید آرا کی محبت میں بیمار ہیں۔ مہتاب اور مہر نگار نواب کے راز دار اور خطوط کا ذریعہ بنتے ہیں۔ خورشید آرا کے والد خورشید آرا کی شادی اس کے خلیرے بھائی بہادر سے کرانا چاہتے ہیں۔ اور بڑی بیگم خورشید آرا کی والدہ یہ بھی ان سے متفق تھیں۔ ایک دن بہانہ کر کے خورشید آرا اور اس کی بہنیں سیر و تفریح کے لئے جاتی ہیں اور وہاں نواب مخمور سے ملاقات ہوتی ہے۔ دونوں میں عشق و عاشقی کی باتیں ہوتی ہیں۔ اس کا پتہ خورشید آرا کے دوسرے بھائی کو معلوم ہوتا ہے وہ آگ ببولا ہو کر ان کو ڈانٹتا ہے۔ خورشید آرا گھبرا جاتی ہے۔ اور بدنامی کے ڈر سے خودکشی کرنے کو سوچتی ہے۔

مرزا بہاد جو خورشید آرا کا خلیرا بھائی ہے جس سے خورشید آرا کی شادی ہونے والی ہی ہے۔ مرزا بہادر اور رنبیر سنگھ مرزا مخمور سے بدلا لینا چاہتے ہیں۔ جب اس کی خبر نواب مرزا مخمور اور ان کے دوست شیودت کو معلوم ہوتی ہے تو وہ ایک ترکیب سوچتے ہیں اور اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

کشن پرشاد کے ناول مکالموں سے بھرے پڑے ہیں۔ دیہاتی ہو یا حیدرآبادی ان پڑھ ہو یا پڑھا لکھا وہ ہر ایک کے انداز سے بہ خوبی واقف تھے۔ بیگماتی زبان، ماماؤں کی ہنسی ٹھٹھول، ساقیوں کی گالی گلوج، ہر طبقے کے لوگ، پیشے کے زبان سب کے سب اپنے اپنے کرداروں میں جڑے ہوئے تھے۔ اور معاشی و سماجی زندگی سے وابستہ تھے۔ کشن پرشاد نے اپنے اردگرد ہونے والے واقعات کو ناول میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے زندگی میں ہونے ولے حقائق کو بیان کیا ہے۔

مرزا بہادر نواب مخمور کو مارنے کے لئے ایک سازش کرتا ہے۔ وہ غصّہ میں آ کر نواب مخمور سے انتقام لینا چاہتا ہے ان کے جذبات کو کشن پرشاد اچھے انداز میں بیان کرتے ہیں ملاحظہ ہو:

''بہادر: افوہ اس مرزا نوشہ (مخمور) لونڈے نے ہمیں چکما دیا۔ اس کا
خون ہی نہ پیوں تو مرزا بہادر نام نہیں۔ آیں دیکھو تو اس شہدے نے

کہاں ٹکی جمائی ۔ واللہ غضب کیا پاجی نے ۔ ٹہلتے ہوئے اور دست افسوس ملتے ہوئے بھیا اس وقت رنبیر سنگھ نہ ہوتے ورنہ پھر تو اس کا سر قلم سا اڑا دیا تھا ۔ کیا کروں میرا وطن نہ ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر اس کو میں نے جہنم رسید نہ کہا ہو تو سہی ایک باپ کا نہیں ۔'' ۱۰؎

کشن پرشاد اس ناول کو آگے بڑھاتے ہیں اور چونکا دینے والے واقعات کو پیش کرتے ہیں ۔ ان کے ناول پڑھتے وقت قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے ۔ اس ناول میں انھوں نے علاقائی زبان کو بھی استعمال کیا ہے ۔ ان کے ناولوں میں علاقائی اثرات نظر آتے ہیں ۔

حیدرآباد میں ہندوؤں کی مادری زبان تیلگو اور مسلمانوں کی مادری زبان اردو ہے ۔ یہاں لوگ مل جل کر رہتے ہیں ۔ اردو اور تیلگو زبان دونوں جانتے تھے ۔ مہاراجہ نے اس ناول میں تیلگو زبان کو کردار کے ذریعہ ادا کرایا ہے ۔ اقتباس دیکھئے:

''نواب صاحب تلنگی زبان میں مانجھی سے کہا اسٹیمر روک ۔ خورشیدی نے زور سے مانجھی کو ڈانٹ بتائی ۔ خبردار چلا چل ۔ نواب نے پھر تلنگی میں کہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہار تلنگی زبان کا ترجمہ مغلئی زبان یعنی اردو زبان میں بتاتی جاتی ہے ۔ زینت النساء نے بہر سے کہا اری تو چپکے سے تلنگی زبان میں مانجھی سے کہہ دے کہ روک لے مگر آہستہ سے ۔ اس نے کہا (نیوا اِڑا نیلا بٹ ٹو) یہ سنتے ہی اسیٹمر میں ایک قیقہہ پڑا اور سب مارے ہنسی کے لوٹ گئے ۔ مانجھی نے اسٹیمر کو روکا اور بہار نے اپنی بیگم کے حکم سے ڈانٹ کے مانجھی سے کہا (ایمر ا اینڈ کو نیلا بیٹنا وَ ۔ چپدی نیکے وِنو) یعنی حکم نہیں مانتا ۔ کشتی کیوں روکی'' ۔ ۱۱؎

نواب مخمور کے دوست شیودت اور فتح گر دونوں نواب اور خورشید آرا کو ملانے کی ترکیب سوچتے ہیں ۔ اتنے میں معلوم ہوتا ہے کہ خورشید کو کہیں دور بھیج دیا گیا ہے فتح گر اور شیودت اس کا پتہ لگانے کے لئے نکلتے ہیں اور پورے سے پتہ لگا لیتے ہیں کہ خورشید آرا ایک گاؤں مشیر آباد میں دو مہینے تک وہے گی وہ آ کر یہ

بات نواب کو بتا تا ہے اور خورشید آرا کے بارے میں بتانے سے پہلے یہ شعر پڑھتا ہے۔

ہے کور کھے جو نہیں رکھتے ہیں نظر ہم
اڑتی ہوئی چڑیا کے بھی گن لیتے ہیں پر ہم

صبح چار بجے فتح گر اور ایک سپاہی مشیر آباد پہونچتے ہیں تب تک بڑی بیگم خورشید آرا کو وہاں سے لے جا چکی تھیں۔ فتح گر پریشان ہو جاتا ہے۔ یہ ناول فنی حیثیت سے اہم ہے۔ مصنف پلاٹ کو تعمیر کرنے اور کردار کو قابلِ قبول بنانے میں کامیاب ہے۔ کشن پرشاد نے اس ناول کو ایک خاص ڈھنگ سے لکھا ہے۔ میرے خیال سے یہ ایک معیاری ناول ہے۔ ادب میں اس کو کیوں شمار نہیں کیا گیا۔ شاید اس دور میں اس ناول کا مطالعہ نہیں کیا گیا ہو جذبات نگاری اور منظر نگاری کی حیثیت سے بھی یہ ایک اچھا ناول کہلانے کا مستحق ہے۔

چنچل نار:

ناول ''چنچل نار کرشن پرشاد کا تیسرا ناول ہے یہ 1903ء میں طبع ہوا۔ یہ ناول ابتداء میں دبدبہ آصفی میں بالاقساط سے شائع ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد اس کی اشاعت کو روک کر کشن پرشاد نے نظر ثانی کر کے اسے چھپوانے کا انتظام کیا۔ اس ناول میں متعدد مصنفوں اور شاعروں کے تاریخی قطعات ہیں سب سے پہلے اس ناول پر میر عثمان علی خاں کا تاریخی قطعہ ہے۔

چنچل نار معاشرتی ناول ہے۔ اس ناول کا قصہ حسن وعشق سے متعلق ہے اس ناول کے مرکزی کردار پاروتی اور چندرسین ہے۔ پاروتی اس ناول کی ہیروئن اور چندرسین ہیرو ہے۔ ثانوی کردار لیلاوتی (پاروتی کی والدہ) دین دیال پاروتی کے والد، کہاری پاروتی کی راز اور خادمہ ہے۔ متھرا چندرسین کا دوست اور راز دار بھی ہے۔ پاروتی اور چندرسین کی عشق کی داستان دسہرہ کے دن گنگا کے کنارے سے شروع ہوتی ہے۔ متھرا اور کہاری کی وجہ سے پاروتی اور چندرسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ اس ناول میں کشن پرشاد نے ہندو تہذیب اور رسم ورواج کو بیان کیا ہے۔ پاروتی ایک خوش مزاج، شوخ چنچل لڑکی ہے۔ لیکن وہ اپنے نفس پر قابو رکھتی ہے۔ اپنے ماں باپ کی عزت کرتی ہے۔ یہ اپنے مذہب کی پابندی کرتی ہے۔ ماں باپ کی بات

مانتی ہے۔اس ناول میں جگہ جگہ فارسی اوراردواشعار درج ہیں اورجگہ جگہ محاورے بھی شامل ہیں۔کشن پرشاد شاؔد اپنے تمام ناولوں میں قدیم املا کواستعمال کرتے ہیں۔

''چنچل نار''میں کشن پرشاد نے عمدہ منظرنگاری کی ہےاور خدا کے حسین کارناموں کواس ناول میں پیش کیا ہے۔منظرنگاری کی وجہ سے ناول میں دل کشی پیدا ہوگئی ہے۔حسن و تاثر میں اضافہ ہوتا ہے۔اس ناول کا پلاٹ مربوط ہے۔ یہ ایک رومانی ناول ہے۔اس ناول میں کرداروں کی نفسیات کوبھی اجاگر کیا ہے۔سُندرا اورگُن ونتی پاروتی کی سہلیاں ہیں۔جذبات نگاری میں بھی یہ ناول اہمیت رکھتا ہے۔سندرا اپنے نفس پرقابو نہیں رکھتی وہ جوش و جوانی میں اپنی عزت کھوبیٹھتی ہےاور پاروتی کوبھی ایسا ہی سمجھتی ہےلیکن بعد میں پتہ چلتا ہے کہ پاروتی عزت دار اورخود دار لڑکی ہے۔اس سے سُندرا کو اپنی غلطی کا احساس ہوجاتا ہے۔اس کے علاوہ اس ناول میں بے شمار کردار ہیں اور ہر کردار اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ان کرداروں کے مسائل ان کی الجھنیں ان کے غموں اورخوشیوں سے اس ناول کے واقعات ابھرتے ہیں۔اس ناول میں اوربھی کردار پیش کئے گئے ہیں۔لیلاوتی، دین دیال، رام لعل، گھبرو (مٹھائی والا)، رتن سین، متھرا، رنبیرسنگھ، کہاری، استادراوی، زبیدہ بیگم، گوشائیں وغیرہ۔

''چنچل نار''میں کشن پرشاد نے حسن وعاشقی کے ساتھ ہندواور مذہبی عقیدے کوپیش کیا ہےاوراس دور کے نوابی گھرانوں کی پرورش، تعلیم پرزور دیا ہے۔اخلاق کے بارے میں بھی ذکر کیا ہے۔پاروتی کی تعلیم کا انتظام گھرپر ہی ہوتا ہے۔اس ناول میں ہندوتہذیب کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

دسہرہ کے دن پاروتی، لیلاوتی پاروتی کی ماں، سُندرا اورگن ونتی گنگا اشنان کے لئے جاتے ہیں وہاں چندرسین اپنے دوستوں کے ساتھ موجود تھا وہ پاروتی کو دیکھتا ہےاور پاروتی بھی اس پہ عاشق ہوجاتی ہے۔دونوں میں محبت ہوجاتی ہے مگران دونوں کے بیچ بہت سی مشکلات آتی ہیں۔ یہاں تک دونوں بیمار پڑجاتے ہیں۔متھرا اور کہاری کے ذریعہ دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ چندرسین ایک خط لکھ کر کہاری کو دیتا ہے یہ خط دیکھ کر پاروتی شرما جاتی ہے۔وہ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے۔اس کے لئے دین دیال ایک استاد کو اپنے گھر پر بلاتے ہیں مگر استاد کی نیت خراب ہوجاتی ہے۔پاروتی استاد کی نیت کو بھانپ لیتی ہے اور استاد کواچھا سبق سکھاتی ہے۔

پاروتی، شوقین، چنچل نار، چھڑ چھاڑ کرنے والی لڑکی تھی۔ ہر کوئی اس کی اس ادا پہ مرتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ یہ چڑیا ان کے ہاتھ لگ گئی۔مگر پاروتی بہت ذہین اور عقلمند بھی تھی۔اس نے مٹھائی والے کو بھی چکما دیا تھا۔مٹھائی والا میلے میں پاروتی پہ اس طرح فدا ہوا تا ہے اقتباس دیکھئے:

''مٹھائی والا گھبرو تھا چلتا پرزہ۔سب کو تین تین آنے کی مٹھائی تول دی اور پاروتی پر ایسا ریجھا کہ پانچ آنے کی تازی برفی تول دی پاروتی ایک ہی چالاک تھی سمجھ گئی کہ لونڈا مجھ پر ریچھ گیا۔۔۔کیون جی گھبرو کہو تمہاری شادی وادی بھی ہوئی ہے یا ابھی پھٹّیل ہی ہو۔اتنا سننا تھا کہ اس کی رال ٹیک پڑی۔ باچھیں کھل گئیں۔۔۔۔ پاروتی اپنا نام سنولیا بتاتی ہے۔۔۔۔۔ پاروتی کی باتیں سن کر گھبرو جان تو دیتا ہی تھا بہت خوش ہو گیا جامے میں پھولے نہ سمایا۔فوراً برفی تول دی اور مفت اور کہا کہ میری خاطر سے قلاقند بھی لیئے۔''[۱۲]

جس طرح پاروتی مٹھائی والے کو چکما دیتی ہے اسی طرح استاد جی کو بھی بہت اچھا سبق سکھاتی ہے۔ پوری کہانی پاروتی کے گرد گھومتی رہتی ہے۔اس کے مکالمے برجستہ ہیں۔کشن پرشاد نے جذبات نگاری کو اس ناول میں سلیقے سے پیش کیا ہے۔اور انھوں نے کردار نگاری میں معاشی اور مذہبی مسائل کو بیان کیا ہے۔وہ سیدھا سادہ پلاٹ۔ پلاٹ کی تعمیر کی لحاظ سے شآد کا یہ ناول بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ پاروتی کا کردار ایک بہترین کردار ہے۔کشن پرشاد نے اس ناول میں بھی آگ کے ایک حادثہ کے بارے میں لکھا ہے۔ سرمایہ سعادت میں بھی انھوں نے ہوٹل میں آگ کے حادثہ کا ذکر کیا ہے اور اس ناول میں بھی آگ کے حادثہ کا قصّہ کو پیش کیا ہے۔ پاروتی، لیلاوتی، گن ونتی، سُندرا اور چند خواتین ایک مکان میں رام اور سیتا جی کے بھجن گانے کے بعد کچھ دل لگی کے ہنسی مذاق کرتی ہیں اچانک اس مکان میں آگ لگ جاتی ہے۔ایک برہمن رام لعل نامی آدمی ان کو آگ سے بچالیتا ہے۔سب محفوظ ہو جاتے ہیں ایک دن رام لعل دین دیال کے گھر پاروتی کا ہاتھ اپنے بیٹے۔۔۔۔ کے لئے مانگنے آتا ہے۔دین دیال ہاں کہہ دیتا ہے۔کیونکہ اس نے دین دیال کی بیوی اور بیٹی کو آگ سے بچایا تھا۔رام لعل کا بیٹا عمر میں پاروتی سے چھوٹا تھا۔ پاروتی اپنے ماں باپ کی بہت

عزت کرتی تھی۔مگر اس کو چندرسین سے محبت تھی۔ وہ اس معاملے میں خاموش رہتی تھی۔ ناول پڑھتے وقت ناول کے پورے کرارا اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آتے ہیں گویا قاری خود دیکھ رہا ہوایسا محسوس ہوتا ہے۔ یہ کشن پرشاد کا تخلیقی کمال ہے۔

کشن پرشاد نے اس ناول میں مقامی زبان کو استعمال کیا ہے۔ ان کے ناولوں میں کردار اپنے اپنے مقامی زبان بولتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''برہمن نے جواب دیا۔ ناہیں ڈاکٹر صاحب ہم ڈرت ناہیں ہم تو سپاہی کنو جئے ہیں۔ہم نے بھگوان کی کرپا سے بارود کی آگ اور گولیوں کی برکھا سے مکالبہ(مقابلہ) کیا ہے۔''۱۳؎

چنچل نار میں کشن پرشاد نے مختلف محاوروں اور کہاوتوں کو بھی استعمال کیا ہے۔محاوروں کو انھوں نے اپنے ناول میں مکالموں کے ذریعہ اس طرح بیان کیا ہے:

''پاروتی: میں خوشی سے اسکا مطلب پورا کردوں گی۔موئے کو مجھ سے ہی پرچھم ملی ہی کا ہیکو ہوگی۔تم ذرا چپ رہو دیکھتی جاؤ۔ایسا تگنی کا ناچ نچاؤں کہ عمر بھر یاد کرے۔۔۔۔سادگی کی کسی کی تمہیں بھائی ہماری یا ہماری بہن سندرا کی۔سندرا کہتی ہے ہائیں بہن کیوں وہ کون ہم کون۔ اب تو نے پیٹ سے پاؤں نکالے''۱۴؎

مکالمہ نگاری کے اعتبار سے یہ ناول کامیاب ہے۔اس میں جو مکالمے پیش کئے گئے ہیں وہ کہیں کہیں بہت طویل ہوگئے ہیں لیکن اان کو پڑھنے کے بعد کہیں بھی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔بعض جگہوں پر مکالمے بالکل مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ معنی خیز بھی ہیں۔کشن پرشاد کے کرداروں نے مکالموں کو جس طرح سے ادا کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے تجربات بہت گہرے ہیں۔ پڑھے لکھے کرداروں کے ذریعہ ادبی اور عالمانہ مکالمے ادا کرائے ہیں۔غم وخوشی، رونا ہنسنا، اور ہنسی مذاق کی باتوں کو بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔ پاروتی اور اس کی دوسہلیاں سندرا اور گن ونتی باغ کی سیر کو جاتے ہیں وہاں انھیں ایک جوان مل جاتا ہے اور ان کی شوخیوں کو دیکھ کر چھیڑنے لگتا ہے تو پاروتی اس کو بھی چکما دیتی ہے۔ پاروتی اور جوان کی گفتگو

ملاحظہ فرمایئے:

''پاروتی: اصل میں میرا نام کامنی ہے۔ دیانند وچھت کے
مکان میں رہتی ہوں۔محلّہ کا نام انارکلی ہے جہاں
انارکا باغ ہے۔اب تم سے جان پہچان ہوجائے گی
تو تمہارے گھر میں رہا کرونگی۔اب تم بتاؤ کہ تمہارا
نام کیا ہے۔

جوان: میرا نام رنبیر سنگھ راجپوت سپاہی ہوں۔پاروتی:
سپاہی ہوکر عورتوں کے بے دام غلام بھی
ہوگئے۔۔۔لو اسے پاؤں پھیلائے۔رنگ لائی
گلہری''۱۵

کردار نگاری کے لحاظ سے بھی یہ ناول اہمیت رکھتا ہے۔اس ناول میں شاؔد نے بہت سے کردار پیش کئے ہیں اور ہر کردار کی انفرادیت کو پوری طرح نمایاں کرتے ہوئے اس کے احساسات اور نفسیات کی فن کارانہ عکاسی کی ہے۔انھوں نے پاروتی کے اطراف گھومتی رہتی ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں کہیں بھی سیاسی منظر کو پیش نہیں کیا۔صرف مذہبی، اخلاقی اور سماجی مسئلوں پر اپنا قلم اٹھایا ہے۔اس لئے شاید ان کے ناولوں کو اردو ادب میں خاص جگہ نہیں دی گئی۔اور ان کے ناولوں کو بہترین ناولوں میں شمار نہیں کیا گیا۔ان کے ناولوں کو وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق ہیں۔یہ ہلکے پھلکے ناول سمجھے جاتے ہیں۔ کشن پرشاد نے اپنے اپنے عہد کی اجتماعی زندگی کے اہم مسائل کو نہیں چھیڑا بلکہ امراء اور نوابی گھروں کے چند پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔زبان و بیان اور زماں و مکاں سے یہ عمدہ ناول ہے۔جذبات نگاری اور منظر نگاری کے لئے بھی یہ ناول قابل تعریف ہے۔

شام کو سندر باغ میں پاروتی رنبیر سنگھ (جوان) کو چکما دے کر واپس اپنے گھر کو لوٹتی ہے تو ایک مکان کے پاس سے آواز آتی ہے۔

واراک اور بھی شمشیر نظر کا لِلّٰہ

اومری سمت سے منہ پھیر کے جانے والے

یہ سنتے ہی پاروتی گاڑی کو رکوائی ہے تب اس کی نظر بالا خانے کے طرف پڑی جدھر سے یہ آواز آئی تھی۔ وہاں ایک نو جوان (چندرسین) کرسی پر بیٹھا تھا۔ دونوں کی نظر ایک دوسرے پر پڑی۔ آنکھ سے آنکھ کا ملنا تھا کہ اور جب پاروتی نے اس جوان دیکھا تو اس تو وہ بے ہوش ہو جا تا ہے۔ اور عشق کی بیماری میں مبتلا ہو جا تا ہے۔ دن بہ دن اس کی حالت بگڑتی گئی۔ اِدھر پاروتی بھی پریشان تھی کہ وہ کون شخص تھا جو میری نظر سے بیمار پڑ گیا۔ یہ سوچ کر یہ بھی بیمار ہو جاتی ہے۔ دونوں طرف آگ لگی ہے برابر کا معاملہ ہو گیا تھا۔ سب گھر والے پریشان تھے۔ اس کے بعد متھرا اور کہاری پاروتی اور چندرسین کو ملانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ ان کے راز اور خطوط کا ذریعہ بھی ہیں۔ اس ناول میں بھی کشن پرشاد نے خطوط کے ذریعہ قصّے کو آگے بڑھایا ہے۔

اسلوب نگاری کی وجہ سے بھی یہ ناول ایک اچھا ناول کہلانے کا مستحق ہے۔ ان کا اسلوب سادگی سے بھرا ہوا ہے۔ زبان پر ان کو عبور حاصل ہے۔ کشن پرشاد نے اس ناول میں ایک ہندوتہذیب کو اجاگر کیا ہے۔ لیلاوتی اور دین دیال اپنے مذہب کے اصول پر عمل کرتے تھے۔ ہر مذہب کے اپنے عقیدے اور اصول ہوتے ہیں۔ اور ہر مذہب والے اپنے اپنے اصولوں پر چلتے ہیں۔ لیلاوتی ایک خواب دیکھتی ہے۔ اس خواب کی وجہ ناول میں اہم موڑ پیدا ہوتا ہے۔ لیلاوتی یہ خواب دین دیال کو سناتی ہے۔ لیلاوتی کی زبان سے سنئے:

> ''میں نے پرسوں رات دیوی ماتا کو (ڈنڈوت کرکے) خواب میں دیکھا تھا۔ پہلے تو میں سمجھی کہ پڑوس کی کوئی عورت ہے مجھ سے ملنے آئی ہوگی۔ میں اپنے آسن پر بیٹھیں رہی۔ آنگن میں آتے ہی اس نے مجھے گھُرک کر کہا ''کیوں اے لیلاوتی ہم کو پہچانتی نہیں'' میں ڈر گئی۔ میرے منہ سے نکلا کہ ''مائی میں تم کو نہیں پہچانتی۔'' بس دیوی ماتا نے مجھ پر آنکھیں نکال کر کہا ''میں تیرے پتی کی کل دیوی ہوں''۔ ۱۶

اس خواب کا کیا مطلب ہے، معنی کیا ہیں اور آخر پاروتی کی شادی کس سے ہوتی ہے؟ رام لعل کے

بیٹے کا کیا حال ہوتا ہے۔ جب دین دیال کواس بات کا پتہ چلتا ہے کہ پاروتی کسی کے عشق میں بیمار رہے تو ان کے پاؤں تلے کی زمین نکل جاتی ہے۔ لیلاوتی بھی اس واقعہ کوسن کرگھبرا جاتی ہے۔ کشن پرشاد واقعات کو مکالموں کے ذریعہ اس طرح ادا کرتے ہیں گویا ہمارے آنکھوں کے سامنے یہ سب واقعات ہورہے ہیں۔ جس کوہم دیکھ رہے ہیں اور ہمارے آس پاس میں ہورہے ہیں۔ ان کے ناول بیان کرنے کا انداز یہ ہے کہ قاری کا تجسّس برقرار رہتا ہے اور ناول کو پڑھنے کی دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔

دین دیال پاروتی پر پابندی لگاتے ہیں اس کوکہیں جانے نہیں دیتے اور کسی سے ملنے نہیں دیتے۔ کہاری ایک خط لیکر چندرسین کو دیتی ہے۔ اور چندرسین کی حالت کے بارے میں پاروتی کو بتاتی ہے کہ وہ چند دن کے مہمان ہیں تو پاروتی گھبرا جاتی ہے۔ زبیدہ بیگم جو پاروتی کی بچپن کی سہیلی ہے پاروتی سے ملنے اس کے گھر آتی ہے پاروتی زبیدہ بیگم کو دیکھ کر اپنا دل کا حال بتاتی ہے اور چندرسین کا خط بھی'' زبیدہ بیگم ان دونوں کوملانے کی ترکیب سوچتی ہے۔ اوران کی ملاقات کراتی ہے۔

گوشائیں جی کا کرداراس ناول میں اہم کڑی ہے۔ گوشائیں جی کو پنڈت دین دیال بھی مانتے ہیں۔ چندرسین کی حالت ان کی چاچی سے دیکھی نہیں جاتی وہ رتن سین سے کہتی ہے تم گوشائیں جی سے مل کر آ ؤ۔ رتن سین رات میں گوشائیں جی سے مل کرآتے ہیں۔ گواشائیں جی ایک فقیر تھے۔ ان کے پاس ہندو مسلم سبھی لوگ آتے تھے۔ لوگ کثرت سے گوشائیں جی کے معتقد تھے وہ خدا پرست اور متوکل تھے۔ گوشائیں جی کا نام ترک علی شاہ ہے۔ دین دیال بھی گوشائیں کے پاس جاتے ہیں۔ گوشائیں جی سب حال جانتے تھے وہ کہتے ہیں تم اپنی بیٹی کی شادی رتن سین کے بیٹے چندرسین سے کردو۔ اوراس طرح ان دونوں کی شادی ہوجاتی ہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد نے کو پندرہ چھلاؤں (حصّوں) میں تقسیم کیا ہے۔ اس ناول میں ادیبوں و مصنفوں کے تاریخی قطعات درج ہیں۔ اس ناول کے مصنف کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

ناول ''چنچل نار'' کے مصنف سے متعلق اختلاف رائے:

ناول ''چنچل نار'' کے بارے میں قمر رئیس اور حکم چند نیؔر نے رسالہ ''ہماری زبان'' میں بحث کی

ہے اور حکم چند نیّر نے ایک جگہ لکھتے ہیں

''سرشار مرحوم ایک کامل الفن ناول نگار تھے۔ انھوں نے بڑے بڑے ضخیم ناول لکھے اور ان میں سینکڑوں اشخاص کو وجود دیا۔ مگر وہ اپنے موقلم سے ایسے ایسے رنگ بھرتے ہیں کہ ہر ایک کردار کی انفرادی حیثیت قائم رہ جاتی ہے۔ ان کا کوئی کردار کسی دوسرے کردار سے مماثلت نہیں رکھتا سرشار سے یہ کیسے ممکن ہوسکتا تھا کہ وہ کامنی اور پاروتی کے نقوش کو ایک ہی قسم کے رنگوں سے ابھارتے۔ جبکہ سرشار کے پاس نہ اشخاص کی کمی تھی نہ رنگوں کی۔ ہاں یہ تو ہوسکتا ہے کہ مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد نے کامنی کو نمونہ بنا کر ناول لکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے یہ بات خارج از بحث ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ناول ''چنچل نار'' شاؔد کی تصنیف ہے'' ۱۷

چند مصنفوں اور ادیبوں کا خیال ہے کہ شاؔد دوسروں سے لکھوا کر سرشار کے نام سے چھاپتے تھے اس کے جواب میں مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد لکھتے ہیں:

''بے شک میں شاعر نہیں، نثار نہیں مگر ایسا بھی نہیں کہ بغیر کسی سہارے کے نثر نہ چل سکے۔ آزمائش منظور ہے تو قلم و دوات لیں۔ کوئی مضمون، یا خط یا کوئی سین وہ بھی لکھیں بندہ بھی گھسیٹا ہے۔ اس وقت قلعی کھل جائے گی۔ یہ میں نے مانا کہ میں منشی نہیں ہوں۔ انشا پردازی مجھے نہیں آتی اور نہ مجھے ابوالفضل یا نعمت خاں علی ہونے کا دعویٰ ہے۔ مگر ہاں مرزا علی بابا شیرازی الاصل کا شاگرد ہوں۔ سیدھی سادھی نثر لکھتا ہوں۔ مگر انشائے خلیفہ اور انشائے مادھورام سے کم نہیں۔ عبارت سلیس، محاورہ خاص ایرانی، بندش چشت نہ ہو تو ہار جاؤں''۔ ۱۸

اس سلسلے میں ڈاکٹر حبیب ضیاء لکھتی ہیں:

''مہاراجہ کی یہ عادت تھی کہ وہ جس صاحب طرز شاعر یا ادیب کو پسند کرتے تھے جس شاعر یا ادیب کا اسلوب انھیں پسند آجاتا تھا وہ اس کی کامیاب تقلید کی کوشش کرتے تھے۔ داغؔ کے البیلے انداز کو بھی اپنانے کی کوشش کی ہے اس طرح انھوں نے ''چنچل نار'' میں سرشار کا رنگ اڑانے کی سعی کی ہے۔۔۔۔ سرشار کے حیدرآباد آنے سے پہلے ہی مہاراجہ سرشار کے اندراز واسلوب سے متاثر تھے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر سرشار کا تھوڑا بہت اتباع بھی کرنے لگے تھے۔ چنانچہ ان کا پہلا ناول ''مطلع خورشید'' جو سرشار کے حیدرآباد آنے سے پہلے لکھا گیا تھا۔ ''مطلع خورشید کے مطالعہ کے بعد ''چنچل نار'' کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مہاراجہ نے سرشار کے اتباع کی جو کوشش ''مطلع خورشید'' میں شروع کی تھی وہ ''چنچل نار'' میں زیادہ کامیاب ہوئی ہے۔ معترضین ''مطلع خورشید'' کا مطالعہ کرئے تو شاید اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوتے۔''[۱۹]

کشن پرشاد شاد نے ناول ''بزمِ خیال'' میں ہو بہو ''فسانۂ آزاد'' کے طرز کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ بزم خیال کے کرداروں کے نام بھی انھوں نے فسانۂ آزاد سے لیے ہیں۔ جیسے سپھر آرا، بہار، بڑی بیگم، نواب، مغلانی وغیرہ وغیرہ۔

عظیم الشان صدیقی نے مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کے ناولوں اور ان کے کرداروں کا مختصر طور پر ذکر کیا ہے۔ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ ناول ''مطلع خورشید''، ''فسانۂ آزاد'' کے ضمنی قصّہ ہمایوں فر اور سپھر آرا کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ لیکن اس میں نہ تو معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے اور نہ ہی جذبات نگاری یا کردار نگاری کا جوہر موجود ہے۔ اس لئے یہ ناول شروع سے آخر تک خشک اور پھینکا ہے۔

میں نے مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کے تمام ناولوں کا مطالعہ تفصیل سے کیا ہے۔ 'مطلع خورشید' میں معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے اور اس میں جذبات نگاری ہے اور کردار نگاری بھی۔ یہ ناول پھینکا اور خشک نہیں

ہے بلکہ اس میں شروع سے لے کرآخر تک تجسّس کو برقرار رکھا گیا ہے۔

عظیم الشان صدیقی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''چنچل نار کشن پرشاد نے اختر مینائی خلف الرشید امیر مینائی کے مدد سے لکھا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ اختر مینائی کی تصنیف ہے جو مہاراجہ کے نام سے شائع ہوئی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ میری رائے میں عظیم الشان صدیقی کا یہ لکھنا حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ انھوں نے اس کے لئے کوئی ثبوت بھی پیش نہیں کیا۔

اس بارے میں مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد خود لکھتے ہیں:

> ''بعض احباب نے اصرار کیا کہ بصورت کتاب ایک ہی وقت یہ طبع اور شائع ہو جائے تو مناسب ہے۔ میں نے اس درخواست کو بدل منظور کیا اور فوراً اس کا طبع ہونا موقوف کر دیا۔ جہاں تک کتاب چھپی تھی وہاں تک سرشار کی نظروں سے گذر چکی تھی باقی جو کچھ حصّہ رہ گیا تھا وہ سن ۱۳۲۱ھ میں لطیف احمد اختر مینائی کی مدد سے پورا ہوا۔ چونکہ سرشار صاحب اور اختر صاحب دونوں ہم وطن اور باعتبار علم و زبان و کلام ایک ہی خاندان کے دو مہرے تھے۔ میں نے مناسب خیال کیا بقیہ حصہ انہیں کے مشورہ سے چھپایا جائے۔ طبع اور شائع ہو کر صورت کتاب میں ہدیہ ناظرین ہوئی۔''[۲۰]

ناول 'چنچل نار' نہ تو سرشار کا ہے اور نہ تو اختر مینائی کا۔ یہ صرف مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کا ناول ہے۔ کشن پرشاد شاؔد نے 'چنچل نار' کے علاوہ دوسرے ناول بھی لکھے۔ جب ان ناولوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سرشار کی طرز میں ناول لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

کشن پرشاد شاد نے اپنے تمام ناولوں میں ایک ہی تکنیک کو اپنا ہے۔ سرمایۂ سعادت میں ایک حادثاتی واقعہ کو بیان کیا ہے۔ کلکتہ کے ایک ہوٹل میں بجلی گرنے سے آگ لگ جاتی ہے اور مطلع خورشید میں برات کے وقت دولہا گھوڑے سے گر کر مر جاتا ہے اس کا بیان ہے اور 'چنچل نار' میں پنڈت دین دیال کے نئے مکان میں آگ لگ جاتی ہے جہاں بوڑھی اور جوان عورتیں تہورا کی خوشی میں رام سیتا کے بھجن کے بعد گانا

وانا گاتی رہتی ہیں۔آگ کی وجہ سے چندعورتیں زخمی ہوجاتی ہیں۔رام دیال نامی شخص آخران کوآگ سے بچاتا ہے۔اورناول ’بزمِ خیال‘ میں1908ء کی طغیانی کے واقعات کا بھی ذکر ہے۔

ہرناول میں انھوں نےعشق وعاشقی اور مذہبی عقیدوں کو پیش کیا ہےاوراس دور کےنوابی گھرانوں کی پرورش،تعلیم پراوراچھے اخلاق پرزوردیا ہے۔ان کے ہرناول میں شادی بیاہ کےرسم ورواج، رہن سہن، پکوان،لباس، زیورات کا تذکرہ ملتا ہے۔اس طرح سے ان کے سب ناولوں میں کچھ واقعات اورتہذیبی سماجی لوازمات کےتذکرے میں مماثلت پائی جاتی ہے۔

بزم خیال:

’’بزمِ خیال‘‘ کشن پرشاد کا چوتھا ناول ہے۔اس ناول کوانھوں نے 1909ء میں لکھا۔ یہ ناول محبوب پریس علاقہ پیشکاری سے طبع ہوا۔اس ناول میں تاریخی قطعات نہیں ہیں۔ یہ ایک ضخیم ناول ہے۔ یہ ناول تین حصوں پرمشتمل ہےاس کے جملہ صفحات 962 ہیں۔اس ناول کا ہیرونواب ہے۔رفیق قلندراور پیر مردف عرف جگت نانا نواب کے دوست ہیں۔اس ناول کا مرکزی کردارنواب کا ہے۔اورضمنی کردار میاں نصیر،جگت نانا،قلندر، رفیق، رابرٹ،سپہر آرا، بہار، بڑی بیگم وغیرہ۔نواب صاحب میاں نصیر کی شادی پھوپھیری بہن سے کرانا چاہتے ہیں مگرنصیرسپھر آرا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔نصیرولایت جا کرتعلیم حاصل کر کے آتا ہے وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔نصیراپنے دل کی بات پیرمرد(جگت نانا) کو بتاتا ہے۔جگت نانا نواب کومنا لیتے ہیں مغلانی سپھر آرا کی خادمہ اورراز دار بھی ہے۔ وہ نصیراور سپہر آرا کے درمیان خطوط کا ذریعہ بنتی ہے ایک دوسرے کو پیغام پہنچاتی ہے۔ سپہر آراایک شریف گھرانے کی لڑکی ہے اور وہ اپنے مذہب پرقائم رہتی ہے۔اس میں اخلاقی اور مذہبی انداز کی باتیں بھی ہیں۔ پیرمردجگت نانا کا کردار اس ناول میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔اس کے کردارکو’’فسانۂ آزاد‘‘ کےخوجی کے کردار سے مشابہ قراردیا جاتا ہے۔اس ناول میں کشن پرشاد نے حیدرآباد کی تہذیب کو بہت اچھے طریقے سے پیش کیا ہے۔شادی بیاہ کے رسم ورواج کھانا، پینا،لباس،زیورات وغیرہ کی تفصیل بھی ملتی ہے۔

اس ناول میں مہاراجہ کشن پرشادشاؔد نے سب سے پہلے قدرت کےحسین نظاروں کا ذکرکیا ہے۔

خدا کی قدرت دل کو بہت لبھاتی ہے۔ خدا کی شان سب سے نرالی ہے۔ اس ناول کے ہیرو نواب ہیں اور ان کے دوست رفیق ہیں۔ نواب اور رفیق دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگتے ہیں انگریزی معاشرت کے متعلق سے باتیں ہوتی ہیں۔ یورپ کی طرز معاشرت اور ہندوستان کی طرز معاشرت کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے۔ نواب ان دونوں معاشرتوں میں فرق بتاتے ہیں۔ انگریزی طرز معاشرت میں عورتوں کو پوری آزادی اور مرد کے برابر رعایت کی مستحق ہیں۔ اور ہمارے یہاں عورتوں کو اس قدر عزت اور منزلت نہیں ہے۔ اور یورپ کی طرز معاشرت میں عورتوں کو مرد کے مساوی تعلیم حاصل کرنے کی پوری آزادی ہے۔ مگر ہمارے یہاں عورتوں کو اس طرح کی آزادی نہیں ہے۔ رفیق اور نواب اس روز کو یاد کرتے ہیں جب طغیانی سے حیدرآباد تباہ ہوا تھا حیدرآباد کا جوبن تھا وہ بگڑ چکا تھا۔ اس کے بارے نواب اور ان کے دوست ذکر کرتے ہیں اقتباس دیکھئے:

''نواب: اُس روز بندہ بھی اجڑی ہوئی بستیوں کو دیکھنے گیا تھا جن کی آبادی طغیانی رودِ موسیٰ کے نذر ہوگئی ہے۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ میں آپ سے نہ مل سکا۔

رفیق: اللہ عجیب عبرت خیز سین ہے جس طرف دیکھئے سنّاٹا ہُو کا میدان۔

نواب: کیا عرض کروں حیدرآباد کا وہ اٹھتا جوبن اور اس کا وہ حُسن دلفریب جوان بستیوں کی آبادی کا باعث تھا آن کی آن میں خواب و خیال ہوگیا۔۔۔ بخدا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ خدائے تعالیٰ شاہِ آصف کے فیض کو ابدالآباد جاری رکھے۔ حیدرآباد کی وہ شان جبروتی جو ایک ہفتے کے قبل تھی اور جس کا نکھار اور بناؤ سنگھار عروس بہار کے عارض زیبا کا غازہ تھا اور جس کے باعث اس کو عروس البلاد کہا کرتے تھے اب اس کے کھنڈروں کے دیکھنے کے بعد دل اس قدر متاثر ہوجاتا ہے کہ رونا آتا ہے فاعبروایااولی الابصار''۔21

نواب اور رفیق کے درمیان باتیں ہوتی رہتی ہیں کہ جگت نانا عرف پیر مرد تشریف لاتے ہیں جن کا اصل نام عبدالصمد خان ہے۔ مگر جگت نانا کے نام سے مشہور ہیں۔ نواب حیدر آباد میں جو طغیانی آئی تھی اس کے بارے میں بتاتے ہیں اقتباس ملاحظہ ہو:

''نواب: طغیانی کا طوفان فلڈ اسی کو کہتے ہیں۔۔

پیر مرد: کیا عرض کروں۔ بالا خانے کا منظر اس مکان کا بہت اچھا تھا۔ وہاں بیٹھا کیفیت دیکھ رہا تھا۔ لعشوں کی تو کچھ گنتی نہ تھی خدا جانے لاکھ آدمی تھے یا دو لاکھ یا اس سے زیادہ۔ مگر یہاں تو حساب دو تین ہزار کا ہی لگایا جاتا ہے۔

نواب: اجی قبلہ دو لاکھ آدمی کیا ہنسی کھیل ہے۔

پیر مرد: ہنسی کھیل۔ کیا معنی۔ قہر الہیٰ کے نزدیک کیا بڑی بات ہے توبہ کرو۔ ابھی حال میں سنا کہ کہیں ولایت میں زلزلہ جو آیا تو کئی لاکھ آدمی زندہ در گور ہو گئے۔''۲۲

ناول ''بزمِ خیال'' میں پیر مرد عرف جگت نانا کا کردار دلچسپ اور شاہکار کردار ہے جب بھی اپنی قابلیت کا اظہار دوسروں کے سامنے کرنا چاہتا ہے تو پوری کی پوری عبارت روانی کے ساتھ فارسی میں بولتا چلا جاتا ہے اور اس کے اس انداز کو ناول میں جگہ جگہ دیکھا جا سکتا ہے مثلاً

پیر مرد: میاں کیا پوچھتے ہو۔ وہاں سے جو جوش و خروش اور جزو مدور کا دریا کا نظر آتا تھا۔ خدا پھر نہ دکھائے۔ رسیدہ بود بلائے ولی بخیر گزشت۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

ناول ''بزمِ خیال'' کی زبان پر فارسی اور عربی کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں جو اس عہد یا اس کے زمانۂ تصنیف سے گہرا رشتہ رکھتے ہیں۔ خوش حال اور اعلیٰ تہذیب یافتہ طبقہ اپنی گفتگو میں فارسی اور عربی زبان کے الفاظ استعمال کرتا تھا۔ اور یہ بڑی حد تک یہی اس دور کا تہذیبی ماحول تھا۔ اس وقت کے تہذیبی ماحول، سیاسی حیثیت اور لسانی ڈھانچے کو مدنظر رکھتے ہوئے سب سے پہلے ''بزم خیال'' کی زبان پر عربی اور فارسی کے اثرات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بغیر کشن پرشاد کے ناولوں کی تہذیبی ماحول کی

شناخت کرنا پوری طرح ممکن نہیں۔مثلاً جشن وجلوس، پیدائش وموت،شادی بیاہ،رسم ورواج،خوشی وغم،اور سیر وسیاحت وغیرہ کےموقعوں پر جوالفاظ استعمال کئے گئے تھے۔ان کی صرف لغوی قدر و قیمت ہی نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ ایک دوسرے سے مل کر اپنے دور کی تہذیبی خصوصیات کونمایاں کرتے ہیں اور اپنی معنویت کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔

اس ناول میں مہاراجہ نے قرآن کی آیات کا بھی استعمال کیا ہے۔چندعربی کے چندالفاظ مندرجہ ذیل ہیں۔

فاعبر ووایااولی ابصار،

الّھُمَّ زِدفَزد،

اِیاک نَعبدُ وایاکَ نستعَین،

سبحان عرَبی العالیٰ۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔

چوں کہ ہندوستان کےمسلم حکمرانون کے درباروں کی زبان فارسی ہی رہی۔کشن پرشاد کے ناولوں میں فارسی اورعربی کے اثرات نمایاں نظرآتے ہیں۔عربی اور فارسی کے الفاظ کےعلاوہ جملوں کی ساخت، تراکیب، محاورے،ضرب الامثال،تلمیحات، اضافتیں اور اشعار وغیرہ بھی زیادہ تر انھیں زبانوں کے استعمال کئے ہیں۔اس قسم کی طرزتحریر کاعکس پورے ناولوں میں نمایاں طور پرنظرآتا ہےمثلاً فارسی کےالفاظ مندرجہ ذیل ہیں۔

نےغمِ دردنےغم کالا،

مزید برآن،

رسیدہ بود بلائے ولی تجیر گذشت،

این دعاازمن واز جملہ جہا آمین باد،۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔

اس ناول میں کئی کردار ہیں اور ہر کردار اپنی انفرادیت رکھتاہے۔انھیں کرداروں کے مسائل ان کی الجھنیں اوران کےغموں اورخوشیوں سے اس ناول کے واقعات ابھرتے ہیں۔ ہر طبقے کے کردار اس میں ملتے ہیں مثلاً راوی، رام بھٹ، نجومی، حکیم صاحب،قلندرشاہ، مغلانی، خانساماں، دلفروز، بڑی بیگم،

بڑھیا (جگت نانا کی بیوی) گھسّو، شریفہ، عضمت، رابٹ، مہوش، سیاح، محمود، نسیمن، نو بہار، کھلاڑو (ماما) وغیرہ۔اس کے علاوہ اور دوسرے کرار بھی ہیں جو اس ناول میں وہمیں ۔

''بزمِ خیال'' کشن پرشاد شآد کا ضخیم ناول ہے۔چنچل نار لکھنے کے 6 سال بعد اس ناول کو لکھا۔اس ناول میں انھوں نے اپنی تخلیقی قوت کو پوری شدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔وہ قلم کے ذریعہ بھی قوم کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔اس ناول میں انھوں نے تعلیم اور مذہبی اخلاق کو اپنا موضوع بنایا۔انھوں نے اپنے ناولوں میں سماجی پس منظر کو پیش کیا۔مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کے ناولوں کو جگہ نہیں ملی۔یہ صحیح ہے وہ ان کے ناول فکری وفنی اعتبار سے زیادہ بلند نہیں ہیں مگر اخلاقی وتہذیبی پس منظر کے حوالے سے ایک مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں حیدرآباد کی تہذیب رسم ورواج نوابی زبان، شریف گھرانوں کی تہذیب کو اجاگر کیا ہے۔انھوں نے فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ اپنے عہد کی اجتماعی زندگی کے اہم مسائل کو نہیں چھیڑا بلکہ نوابی گھروں کے چند پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔اس دور کی تہذیب کو انھوں نے اپنے ناولوں میں کرداروں کے مکالموں کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ان کے ناول عمدہ ہیں قدرت کے مناظر کو شآد نے اپنے ناولوں میں بہت خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے۔ ناولوں کو پڑھتے وقت یہ سارے مناظر ہمارے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ان کے ناولوں کے پلاٹ سیدھے سادھے ہیں اور واقعات میں ربط وتسلسل بھی موجود ہے۔ میرے خیال میں ان کے ناول اردو ناول نگاری کی تاریخ میں جگہ پانے کے مستحق ضرور ہیں۔

حوالے

۱۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی زندگی کے حالات، مہدی نواز جنگ 1900ء، ص:87

۲۔ ''سرمایۂ سعادت''، مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد، 1887ء، ص:3

۳۔ ایضاً، " " "ص:14,15

۴۔ ''مطلع خورشید''، مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد، 1897ء، ص:8,9

۵۔ ایضاً، " " "ص:16,17

۶۔ ایضاً، " " "ص:30

۷۔ ایضاً، " " "ص:31

۸۔ ایضاً، " " "ص:48

۹۔ ایضاً، " " "ص:53

۱۰۔ ایضاً، " " "ص:79,80

۱۱۔ ایضاً، " " "ص: 133, 134

۱۲۔ ''چنچل نار''، مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد، 1903ء، ص:13

۱۳۔ ایضاً، " " "ص: 24

۱۴۔ ایضاً، " " "ص: 49,50

۱۵۔ ایضاً، " " "ص: 54, 55

۱۶۔ ایضاً، " " "ص: 180

۱۷۔ رسالہ ''ہماری زبان''، دسمبر 1960ء، ص:2

۱۸۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد شاؔد حیات اور ادبی خدمات، ڈاکٹر حبیب ضیاء، 1978ء، ص:53

۱۹۔ ایضاً، " " "ص:153

۲۰۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی زندگی کے حالات، مہدی نواز جنگ، ص: 7,8

۲۱۔ ''بزمِ خیال''، مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد، 1909ء، ص: 7,8

۲۲۔ ایضاً، " " "ص: 12-19

بابِ چہارم

کشن پرشاد کے ناولوں میں حیدرآبادی تہذیب کا مطالعہ

سرمایۂ سعادت

''سرمایۂ سعادت'' یہ ایک مختصر سا قصّہ ہے۔ یہ 33 صفحات پر مشتمل ہے۔ اور 33 سے 34 صفحات پر تاریخی قطعات ہیں جو مختلف مصنفوں کے ہیں جن سے ناول کی تاریخ نکلتی ہے ۱۳۰۵ھ یعنی 1887ء۔ گیارہ مصنفوں نے اس ناول پر تاریخی قطعات لکھے ہیں۔ ناول کے پہلے صفحہ اور دوسرے صفحہ پر رباعی اور نعت ہیں۔ اور دوسرے صفحہ میں میر محبوب علی خاں کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ تیسرے صفحہ میں مہاراجہ اپنی تصنیف کا شوق لکھا ہے۔ اور چوتھے صفحہ سے ناول شروع ہوکر 33 ویں صفحہ پر ختم ہوجا تا ہے۔

اس قصّہ میں مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد نے دو بھائیوں کا ذکر کیا ہے۔ اور ان کے اخلاق کے بارے میں بیان کیا ہے۔ یہ ایک قصّہ ہے۔ اتفاق اور نفاق سے رہنے کے فائدے اور نقصان کو بیان کیا ہے۔ اس قصّہ میں پہلے مہاراجہ کشن پرشاد نے ماں باپ کا ذکر کیا ہے۔ اس ناول کے مرکزی کردار شریف اور فریس ہیں۔ خیر النساء اور شریف النساء اور ثانوی کردار ہیں۔ ضمنی کردار کے لیے قمر النساء اور دلاور بیگ، فیضن، شہزادی بیگم، حکیم صاحب وغیرہ۔

اس قصّہ میں مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد نے قصّہ در قصّہ ٹکنیک کو استعمال کیا ہے۔ بڑے بھائی شریف کو نصیحت دلانے کے لیے ایک قصّہ اس ناول میں بیان کیا ہے۔ اس قصّہ کو سُن کر شریف اپنے عادتوں اور کاموں پر شرمندگی محسوس کرتا ہے اور وہ راہ راست پر آجاتا ہے۔

پنڈٹ رتن ناتھ سرشاؔر کے ناولوں میں مکالمے نہ صرف برجستہ برمحل اور فطری ہوتے ہیں بلکہ روزمرہ اور محاوراتی زبان کے استعمال سے وہ ان میں جان ڈال دیتے ہیں۔ عام عورتوں کی بول چال، شریف گھرانوں کی بیگماتی زبان پر بھی انھیں قدرت حاصل ہے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد شاؔد نے ان کے اس اسلوب کو اپنایا۔ اور اسی اسلوب سے کشن پرشاد نے ناول میں دلچسپی پیدا کی ہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد نے اس میں کردار کے آس پاس کے ماحول سے اخذ کیا ہے۔اس ناول میں انھوں نے دکھایا کہ اولاد کے لئے والدین کتنے فکر مند رہتے ہیں۔خاص کر ماں اپنے بچوں کے لیے کتنی پریشان ہوتی ہے اس کو پیش کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''ماں باپ اولاد کی آرام کے واسطے اپنی ذات پر بہتری سختیاں اور مصیبتیں جھیلتے ہیں۔ان کی حقیقت اپنی سے پوچھنی چاہئے جنھوں نے اولاد کو پال کر چھوٹے سے بڑا کیا۔ ماں کی محبت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ نو مہینے ڈھوتی ہے اور اولاد کو جان سے زیادہ عزیز اور محفوظ رکھتی ے اور اولاد کی عمر اور اس کی ترقی کی خواہاں رہتی ہے۔ماں قبروں پر منتیں مانتی ہے۔صدقے اتارتی ہے۔غرض کہ تمام جہاں کی کرتوت کرتی ہے۔دیکھو ابھی بچّہ پیدا ہی نہیں ہوا ایسی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ بچّہ پیدا ہوتا ہے تو اس کو نہلاتی ہے اور تیل لگانے کی فکر میں لگتی ے۔ گرمی، سردی کے احتیاط حد سے زیادہ کرتی ہے۔ بلایں کرلیتی ہے۔ صدقے اتارتی ہے۔ بھلاویں جلاتی ہے۔نظر بد سے بچاتی ہے۔ہنسلی کڑے پہنانے کا خیال گزرتا ہے تو بچاری غریب مفلس یہ ترکیب کرتی ہے کہ تمام دن پیس کر یا مزدوری کر کے چار چھ آنے جمع کرتی ہے۔ جب کچھ روپیے فراہم ہو جاتے ہیں تو چھوٹے سے نازک نازک کڑے ہنسلی بنا کر ہاتھوں اور گلے میں پہناتی ہے۔''[۳]

''سرمایہ سعادت'' میں مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد نے یہ نصیحت کی ہے کہ اپنے والدین سے خوش رہنا چاہیے۔ بھای بہنوں کو مل جل کر رہنا چاہیے۔سب کے ساتھ محبت و دوستی سے پیش آنا چاہیے۔مل جل کر رہنے سے کسی بھی مشکل کو آسان کر سکتے ہیں۔اکیلے رہنے سے مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔مل جل کر رہنا ہماری تہذیب ہے اسی سے ہمارے تہذیب کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ان کا خیال ہے کہ کسی سے بھی نفرت اور دشمنی نہیں رکھنا چاہیے۔محبت اور پیار سے سب کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔اتفاق سے رہیں نفاق

سے نہ رہیں۔مل جل کر رہنے سے ایک دوسرے کے لیے عزت اور محبت بڑھتی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''پس عزیزو تم کو لازم ہے کہ تم اپنے ماں باپ سے خوش رہو۔اپنے کنبہ کے ساتھ اتفاق رکھو۔دشمنوں سے نیکی کرو، دوستوں سے مروّت برتو۔ اتفاق سے گھر پھولے پھلے رہتے ہیں۔ نفاق سے ویراں اور اوجاڑ ہو جاتے ہیں''۴؎

تہذیب تعلیم سے پہچانی جاتی ہے۔حیدرآباد میں تعلیم کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔تعلیم ہی سے انسان کو پرکھا جاتا ہے۔کشن پرشاد تعلیم کے تعلق سے سرمایۂ سعادت میں لکھا ہے کہ ماں کتنی بھی غریب، مفلس کیوں نہ ہو اس کو ہمیشہ اپنے اولاد کی فکر رہتی ہے۔ بچاری غریب ہونے کی وجہ سے اپنے دونوں بیٹوں کو سرکاری مدرسے میں داخل کراتی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''آخر ماں نے سرکاری مدرسے میں جو اکثر غربا کی تعلیم کے لیے سرکار نے ہر ایک بڑے مقام پر قائم کئے ہیں داخل کی اور ان کو تعلیم دلائے۔ بڑے کا نام شریف تھا۔چھوٹے کا نام فریس تھا۔چند سال تک یہ دونوں لڑکے مدرسے میں تعلیم پاتے رہے۔مگر خوش قسمت سے بڑا لڑکا جو شریف نامی تھا وہ نہایت ہی حریف نکلا۔آزاد منش شریر تھا۔چھوٹا اسم با مسمیٰ۔شریف کا یہ حال تھا جب مدرسہ جانے کا وقت ہوتا تختی اور کتابیں بغل میں دبا کر ماں سے مدرسے کا بہانہ کیا اور چلا جو ہیں دروازہ کے باہر ہو گیا۔تختی اور کتاب علٰیحدہ رکھ دیا اور ہمسایہ کے لڑکوں سے گولیاں، لٹّو کھیلنا شروع کیا۔''۵؎

اس ناول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے حیدرآباد کی تعلیمی صورت کیا تھی؟ اور بچے کس طرح تعلیم حاصل کرتے تھے۔اور شریر بچے مدرسہ نہ جا کر گولیاں اور لٹّو کھیلا کرتے تھے۔لٹّو اور گولی کھیلنا اس زمانے کے بچوں کے اہم کھیل تھے۔

''سرمایۂ سعادت'' میں فریس کا کردار نہایت مہذب کردار تھا۔فریس کے اخلاق و کردار سے اسی

کی تہذیب معلوم ہوتی ہے۔ وہ پڑھ لکھ کر سماج میں ایک اچھا مقام حاصل کرتا ہے۔ وہ اپنے پورے فرائض انجام دیتا تھا چاہے وہ گھر کے معاملے میں ہو یا مدرس کی تمام فرائض بخوبی نبھاتا تھا۔ وہ اپنے بھائی اور بھابھی ماں کی بہت عزت کرتا تھا۔ آج کل سب کو ایسے نیک انسان بہت کم ملتے ہیں۔ یہ تہذیب کی اصل کڑی ہے۔ فریس کا کردار، اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''فریس تو خدا داس عقل کا پتلا تھا۔ گویا شرافت اور نجاست کسی نے کوٹ کوٹ کہ اس کے رگِ جان میں بھر دی۔ ہرگز اپنی ماں کو اذیت نہ دیا جو وہ دیتی اسی ہی پر قناعت کرتا۔ چند عرصہ میں فریس نے عربی، فارسی، انگریزی، جغرافیہ، حساب، ہندسہ، سب کچھ تھوڑا تھوڑا دیکھ چکا تھا۔ نہایت لیاقت اور قابلیت پیدا کیا۔ اپنی ماں کے انتقال کے بعد اپنے بھائی کی دیکھ بھال اور گھر سنبھالتا تھا۔''[۶]

اگر اس کو مثبت تہذیب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایک اچھی تہذیب کی اصلی پہچان یہی ہے۔ اچھے اخلاق ہی اچھی تہذیب کی نشانی ہے۔ اس کے برخلاف شریف کا کردار ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''شریف نہایت ہی حریف اور آزاد منش تھا۔ ماں سے مدرسے کا بہانا کیا اور چلا جو ہیں دروازہ کے باہر ہولیا۔ تختی اور کتاب علٰحیدہ رکھ دیا اور ہمسایہ لڑکوں سے گولیاں، لٹھو کھیلنا شروع کیا۔ غرض فضول کاموں میں اپنا وقت صرف کرتا۔ کبھی اسکا چھوٹا بھائی فریس اس کو ایسے فصل عبث سے باز رہنے کو کہتا تو وہ شریر بدمزاج دو پتا نچے اس کے منہ پر رسید کرتا۔''[۷]

ایک اور جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ''مرد شریف سوائے کریما اور دستور الصبیاں کے کچھ نہیں جانتا تھا۔''[۸]

شریف اپنے چھوٹے بھائی فریس سے بہت فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کے دل میں جو آیا کرتا مفت میں مزے لوٹتا تھا۔ محنت سے دور رہتا تھا۔ اور عیاشی کی زندگی گذارتا تھا۔ اپنے کرتوتوں پر اسے تھوڑی سی شرم

بھی نہیں آتی تھی۔ بڑا ہو کر بھی چھوٹے بھائی پر منحصر تھا اور ایسے وقت کو یونہی ضائع کرتا تھا۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''فریس بڑا دانا عقلمند تھا ہر حال میں اپنے بھائی کا حکم نہ ٹالتا تھا۔ ہمیشہ اطاعت گذار فرمانبرداری کرتا تھا۔شریف صاحب مال مفت سمجھکر خوب مزے لوٹتے۔ان کو پس وپیش کی کہاں خبر،محبت کی قدر تو جانتے ہی نہ تھے۔''۹

''سرمایۂ سعادت'' میں کشن پرشاد شاؔد نے لکھا ہے مل جل کر رہنے سے کوئی بھی پریشانی نہیں ہوتی۔ جدا ہونے سے بہت سے پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''اب یہاں اتفاق اور نفاق کو خیال کریں جب تک شریف اور فریس اتفاق سے آرام سے گزری۔ جبکہ بدمعاشوں کی محبت کا اثر ہوا۔اور ان کے کہنے پر شریف نے اپنے عزیز بھائی سے جدا ہوگیا۔ دو مہینے کے عرصہ میں پانچ سو روپے کا قرض دار ہوا۔ایسی بری حالت ہوئی اور اس قدر تباہ ہوا کہ نہایت شرمندہ ہوا۔ یہاں تک قرضخواہوں نے سرکار میں دعویٰ کر کے وارنٹ جاری کیا۔اور مکان وغیرہ نیلام ہو کر کچھ قرضہ ادا ہوا۔باقی جو کچھ رہا سہا تھا اسمیں تنخواہ وضع ہونے کا حکم ہوا۔''۱۰

اس قصّہ میں کشن پرشاد شاؔد نے عقلمندی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چھوٹی عمر ہونے کے باوجود قمر النساء اپنے بھائی کے ٹوٹتے ہوئے گھر کو اپنی عقلمندی سے بچا لیتی ہے۔اس ناول میں بیان کیا ہے۔قمر النساء کا کردار ملاحظہ ہو:

''قمر النساء نہایت شریف اور عقلمند تھی۔ لکھنے پڑھنے میں بھی ہوشیار تھی۔ چنانچہ باپ مرتے وقت اپنی عقلمندی ہوشیار بیٹی قمر انساء کو کونجیاں دے کر مرا۔ باپ کے مرتے وقت قمر النساء کی سولہ برس کی عمر تھی اور ان بیاہی تھی۔ دلاور بیگ کی منگنی حکیم جمال احمد جو راجہ کا خاص طبیب تھا اس کی لڑکی شرف النساء کے ساتھ ہوگئی تھی۔لیکن یہ دلاور بیگ ایسا شریر

نکلا کہ جمال احمد نے منگنی توڑنا چاہا۔قمر النساء نے جوسن پائی کہ بھائی کی منگنی توڑنا چاہتے ہیں۔نہایت متفکر ہوئی۔گوکہ یہ ان بیاہی تھی۔کسی کے مکان کو جانا مناسب نہیں سمجھتی تھیں۔لیکن بھائی کی خاطر مجبوراً ایک روز میانہ میں سوار ہو کر حکیم جمال احمد کی بیوی شہزادی بیگم کے پاس گئی۔''[11]

اس میں مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد نے حیدرآباد کی زبان اور محاوروں کو استعمال کیا ہے۔کرداروں کی گفتگو سے حیدرآباد کی تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔اقتباس دیکھئے۔

''شہزادی بیگم: کیوں،بُوا،قمر النساء آج کدھر راستہ بھولی۔

قمر النساء: جی آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہوئی۔

شہزادی بیگم: کیوں خیریت کچھ کہنا ہے۔

قمر النساء: کہنے کو ڈرتی ہوں کہ مبادا چھوٹ ہو۔اور آپ کو ناگوار معلوم ہو۔خدا کرے میرا کہنا جھوٹا ہی ہو۔مگر اول معافی چاہتی ہوں۔

شہزادی بیگم: بھلا۔کہو تو کیا مضائیقہ

قمر النساء: میں سنی ہوں کہ حکیم صاحب نے دلاور بیگ کی منگنی توڑنا چاہتے ہیں

شہزادی بیگم: میں نہیں جانتی،میاں سے پوچھ کر بولونگی۔

قمر النساء: او،بڑی تعجب کی بات ہے آپ کو نہیں معلوم۔

شہزادی بیگم: کیا تم سے جھوٹ کہنا ہے۔

قمر النساء: بخدا،میں تو سچ نہ مانونگی۔

شہزادی بیگم ہنسکر،اوی کیا تم کو میرا اعتبار نہیں۔

قمر النساء: خدانخواستہ

شہزادی بیگم: آج یہاں سے پوچھ کر کل جواب دونگی۔

قمر النساء :اب اجازت ہے۔

شہزادی بیگم: اوئی پان تو کھاؤ

قمرالنساء: پاندان سے پان کھا کر رخصت ہوئی۔''۱۲؎

پان کھانا حیدرآبادی تہذیب میں شامل ہے۔گھر آئے ہوئے مہمانوں کو پان کھلانا تہذیب کا اہم حصہ مانا جاتا تھا۔آج بھی لوگ بہت شوق سے پان کھاتے ہیں۔پان کے مختلف اقسام ہیں۔

دوسری روز صبح ہی قمرالنساء شہزادی بیگم کے گھر پہونچی۔حکیم صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''قمرالنساء: حکیم صاحب کو دیکھ کر پردہ کئے۔

حکیم صاحب: اجی آؤ باوا،تم ہمارے بچے ہو ہم سے کیا پردہ۔

قمرالنساء: گوکہ بچپن میں حکیم صاحب کے سامنے نکلی تھیں مگر جب سے سنِ شعور کو پہونچی تھی سامنے نکلنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔غرض سامنے جا کر سلام کریں اور بیٹھ گئی۔

حکیم صاحب: کیوں صاحب آپ کیوں تشریف لے آئے

قمرالنساء :شہزادی بیگم کی طرف اشارہ کرکے آپ کو سب معلوم ہے۔

شہزادی بیگم: اوی،سُنی اچھی تہمت لگائی۔بیٹی مجھے کیا معلوم۔

قمرالنساء: ہنسکر۔واہ آپ کو نہیں معلوم

حکیم صاحب: سب کچھ معلوم کیا کریں تمہارے بھائی بڑے آزاد نکلے

قمرالنساء: جب آپ نے اپنا کہا۔پھر اسے کیوں چھوڑتے ہیں۔کیا برزگوں کا یہی قاعدہ ہوتا ہے۔آپ بجائے ماں باپ ہو۔آپ کا اختیار،ہم تو یتیم ہیں بس یہ کہہ کر ڈھائیں ڈھائیں رونا شروع کیا۔انکا رونا ایسا غضب کیا حکیم صاحب اور شہزادی بیگم بھی روئیں۔آخران کو حکیم صاحب نے اور شہزادی بیگم نے دلاسہ دیکر رخصت کیا اور کہا کہ رجب کے مہینے میں شادی کردینگے۔۱۳؎

رہن سہن،رسم ورواج،شادی بیاہ یہ سب تہذیب کی نشانیاں ہیں۔جب کسی کے گھر میں رشتہ طئے ہوجاتا ہے تو ایک ہفتہ سے پہلے ہی شادی کی تیاریاں شروع کردیتے ہیں۔بچے بڑے سب خوش اور اپنے

کاموں میں معروف رہتے ہیں۔کسی بھی معاشرت میں شادی کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔اور ہرایک اپنی اپنی تہذیب کے ساتھ پورے رسم ورواج نبھاتے ہوئے شادی کرتے ہیں۔شادی بیاہ سے تہذیب پہچانی جاتی ہے۔لباس،زیورات،کھانا،پینا،اندازِ گفتگوان سب کے بارے میں جانا جاتا ہے۔دلہن کالباس کیسا تھا کیسے کیسے زیورات پہنتی ہے۔دولھے کے لباس اور بچوں،بڑوں سبھی کے لباس اور زیورات کا پتہ بھی چلتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو۔

''اسی ہی روز سے شادی کی تیاریاں شروع کردیں: حیران مغلانی کو طالب کرکے کُرتیں،چولیں،ازار،سینے کودیں۔اور جوکچھ اپنے مکان میں ماں کے وقت کالباس اور پارچہ موجود تھا۔ان کودھوپ دیا۔غرض اس چالاک،عقلمند،ہونہار قمرالنساء نے پندرہ روز کے عرصہ میں سب کچھ تیاراور مہیّا کیا''۔۱۴

جب کوئی اپنی شادی کی خبر سنتے ہیں خوش ہوکرشرم سے گردن جھکالیتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''قمرالنساء جو ہیں خبر سنیں پھولوں نہیں سمائی۔دل کی مراد برآئی۔انچہ بےسوال رسید دادۂ خدامت سمجھ کرگردن جھکالیں۔اورچُرمُراکرچپ رہیں۔''۱۵

''فیضن: ذرااٹھ کرکیوں بی کیا کہوں

قمرالنساء: فیضن سے بھائی جان سے جوچھو۔جووہ کہیں مجھے منظور ہے۔یہ کہہ کراٹھیں اوراپنی جگہ آئیں۔فیضن کوپان دےکررخصت کیا۔''۱۶

قمرالنساجوہوشیارنیک اوعقلمندلڑکی تھی۔اپنے بھائی کے دھوکے سے جان دےبیٹھی۔ اسکی نصیب کوکشن پرشادشادنے اچھی طرح سے بیان کیاہے۔اچانک قمرالنساءکی موت ہوجاتی ہے۔اس کی موت کے بعدکس طرح ماتم کرتے ہیں اس سے اس زمانے کی حیدرآبادی تہذیب پربھی روشنی پڑتی ہے۔

''ماما: روکر۔ہائے کیا کہوں۔ستم ہوا فلک ٹوٹا۔یعنی غضب ہوا کہ کل

قمرالنساء زندہ دلہن تھی اور آج ملک الموت نے سہرا باندھ گیا۔ کل کے
روز سسرال کو شب گشت آئی تی آج قبر کی شب گشت جاو یگی۔ واے
حیف صد حیف۔ یہ عروس نازنین، نابوت کے سوار ہو کر کنج مرقد
سرہاریگی۔ یا تو اسکا وہ ناز تھا کہ ماں باپ کے کلیجے پر اپنے چودہ برس کی
عمر گذاری (آہ) آج وہ دن ہے ک گور اسکا بستر خشت بالین سرخاک
کالحاف اوڑھے ہوئے پڑی رہیگی۔'' ۱۷

زمانے کا عجیب حال ہے وہ کبھی کسی کو رلاتا ہے تو کبھی ہنساتا ہے کسی کو دکھ دیتا ہے تو کس کو خوشی۔ لوگ دولت کی لالچ میں آ کر بہت کچھ کر دیتے ہیں وہ غلط راستوں پہ آ کر اپنوں کا ہی خون کر دیتے ہیں۔ اس بات کو مہاراجہ کشن پرشاد شآد نے بہت سلیقہ سے بیان کیا ہے۔ اِدھر فریس کی شادی کی بات آتی ہے۔ اس زمانے میں لڑکے یا لڑکیاں اپنی شادی کے لئے خود سے نہیں کہتے تھے بلکہ ان کی شادی کی بات سامنے آتی ہے تو وہ خاموشی سے سُن لیتے تھے۔ یہ اس زمانے میں تہذیب و شرافت کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ خیرالنساء فریس سے اس کی شادی کی بات کرتی ہے تو فریس بہت ادب سے جواب دیتا ہے۔ بھابھی ماں کی مرضی پر اپنی شادی کا فیصلہ چھوڑ دیتا ہے۔ بڑوں کا احترام کرنا حیدرآبادی تہذیب کا ایک اہم رواج تھا۔ کہ چھوٹے پہلے شادی نہیں کرتے تھے۔ پہلے گھر کے بڑے افراد کی شادی کی جاتی ہے۔ فریس تہذیب یافتہ انسان تھا اس لئے اس نے اپنے بھائی کی فکر کرتا اور اسے ہر حال میں خوش رکھتا اور اپنے بھائی شریف کی شادی کرادیتا ہے جب اس کی باری آتی ہے تو وہ یوں جواب دیتا ہے اقتباس ملاحظہ ہو:

''خیرالنساء: میں یہ کہنے آئی کہ تمہارے بھائی کو تمہاری شادی کی نہایت فکر ہے اور مجھ سے کہتے تھے تم اپنے دیور سے پوچھو کہ کب شادی کرینگے۔ اللہ کی عنایت سے لڑکی بھی جوان ہوگئی۔

فریس: آپ صاحبوں کا اختیار میں کیا عرض کروں۔

خیرالنساء: بیشک یہ تمہاری عقلمندی ہے جو ہم پر منحصر رکھی۔ مگر

تمہاری کیا مرضی ہے کیا ابھی کروگے نہیں۔

فریس: جب آپکا ارادہ ہے تو مجھ کو کیا عذر ہے۔'' ۱۸

یہ بات سنتے ہی خیرالنساء اپنے نانا کے پاس غوث خاں سے یہ کہلا بھیجی کہ آپ بھی شادی کی تیاریاں کر لیجیے اور ساز و سامان خرید لیجیے۔ خیرالنساء کے نانا احمد خاں نے شریف النساء کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیتی ہے۔ دس دن کے اندر فریس اور شرف النساء کی شادی ہو جاتی ہے۔ سب خوشی سے رہتے ہیں۔

جب کسی کے گھر میں شادی، بیاہ ہوتا ہے تو اس کے رسم و رواج الگ الگ ہوتے ہیں اور جب بچّہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے رسم و رواج الگ اور بچہ جب 40 روز کا ہو جاتا ہے تو الگ الگ رسم و روادج ہوتے ہیں۔ جب فریس کی بھابھی ماں کو بچّہ پیدا ہوتا ہے تو وہ کتنا خوش ہوتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''غرض نو (۹) مہینے کے لڑکا تولّد ہوا۔ اور سعید نام رکھّا۔ فریس نے اس تقریب کا خوب ٹھاٹ کیا اور سب دوست و اقارب کو جوڑہ بانٹا۔ غرض اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کیا۔ غرباؤں کو خیرات دیا۔'' ۱۹

بچہ تولد ہونے پر دوستوں میں جوڑا بانٹا جاتا تھا۔ ایک روز فریس تجارت کے سلسلے میں کلکتہ جاتا ہے اور اپنے بھائی، بھابھی ماں اور بیوی سے رخصت لے کر کلکتہ پہنچتا ہے۔ وہاں ایک ہوٹل کے کمرہ میں 10 دن کے لئے رکتا ہے۔ دوسرے دن صبح تجارت کا ساز و سامان خریدنے کے لئے بازار جاتا ہے اور سب سامان خرید کر لاتا ہے۔ اچانک وہاں ایک حادثہ ہوتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''بس بجلی کا گرنا ہی تھا کہ کئی آدمی اس کے آسیب سے جاں بحق تسلیم ہوئے اور ایک ہنگامہ ہوا۔ چوطرف سے توپوں کی آواز آتی تھی۔ اور خلایق کا شور۔ فریس ہواس باختہ۔ دوڑ کر باہر نکل آیا۔ جھروکہ سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہوٹل کو آگ لگی۔ خیر گزری کہ یہ نیچے کے تیسرے درجہ میں تھا۔'' ۲۰

اس دور میں خط لکھنے کا رواج تھا۔ خطوط کے ذریعہ بات چیت کی جاتی تھی۔ فریس ایک روز اپنے

بھائی کو خط لکھ کر برجستہ کرتا ہے اس زمانے میں خط لکھنے کا ایک خاص انداز ہوتا تھا۔ مہاراجہ کشن پرشاد شآد نے اس خط کے خاص انداز کو بھی بیان کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

خط

''اخو یصاحب قبلہ وکعبہ۔ مدظلہ العالے۔

بعد قدمبوسی۔ گذارش کہ بندہ دوشنبہ کے روز آپ سے اجازت لیکر سوار

ہوا۔'' ۲۱

اس زمانے میں جلسے ہوتے تھے۔ موسیقی کے خاص دھن جو اس زمانے میں ہی پیش کئے جاتے تھے اس کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ میلے ٹھیلے۔ جلسوں کے ٹھاٹ، موسیقی بجانے، سُننے۔ ناچ گانا یہ سب تہذیب کا ایک اہم جز ہیں۔ اس زمانے میں جلسے ہوتے تھے۔ موسیقی کے خاص دھن جو اس زمانے میں پسند کئے جاتے تھے۔ اس تذکرہ بھی ملتا ہے۔

''جلسہ کا ٹھاٹ ہے نکلے جوان بیٹے نازنینان دلکش۔ سامنے ناچتے ہوئے طبلہ پر تھاپ سارنگی کی چھیڑ چھاڑ کوئی دھر پدگاتی ہے۔ کوئی ٹھمری میں سب کو رجھا رہی ہے۔ کوئی خیال کے سُنّے میں بے خیال ہے۔ کوئی تتالہ گا رہی ہے۔ کوئی خواجہ حافظ کی یہ غزل بھیر دیں میں گا رہی ہے۔ ساقیا بز خیر دردہ جام را ہر ایک ادا ان سروشونکی جان لیتی تھی۔ جب کہیں گٹکری بھری تھی دل پر آرہ چلتا تھا۔ غرض ایک عالم تھا۔ جس کے دیکھتے ہی میاں فریس بھی چکا چوند میں رہ گئے۔ عجب کیفیت معلوم ہوئی ایک گوشہ میں باغ میں بیٹھ کر خوب دیکھے بھالے۔ اور وہاں سے رخصت ہوکر اپنے مکان آپہنچے۔'' ۲۲

اس طرح ہر کوئی جلسہ کے ٹھاٹ میں مگن تھے۔ جلسہ کا ٹھاٹ ہو یا میلے، عرس کا ٹھاٹ دیکھنے کے لائق ہوتا تھا۔ اس میں ہندو مسلم بلا امتیاز کے سب حصہ لیتے تھے۔ کوئی موسیقی کا مزہ لے رہے تھے کوئی غزل سے لطف اٹھا رہے تھے۔ میلے تہوار، جلسے، عروس یہ سب تہذیب کی نشانیاں ہیں۔ ہندو مسلم سب مل کر اس

میں حصہ لیتے تھے۔

شاد نے اس میں تجسّس کو برقرار رکھا ہے۔ یہی تجسّس ہے جو قاری کو بار باران کے ناول پڑھنے کا شوق پیدا کرتا ہے۔ کشن پرشاد کی طرز تحریر عمدہ ہے مگر معیاری نہیں ہے۔ ان کے ناول اردو ادب میں کوئی خاص جگہ نہیں بنا سکے۔ کیوں کہ یہ صرف اخلاقی اصلاح کے لیے لکھے گئے تھے۔ مگران کے لکھنے کا انداز بہت عمدہ ہے۔

سماج یا معاشرہ میں اخلاقیات کو اجاگر کرنے کے لئے یہ قصہ لکھا گیا۔ انھوں نے اس میں معاشرتی زندگی کی تصویر کھینچی ہے۔ کشن پرشاد نے اپنے اردگرد ہونے والے واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ ''سرمایہ سعادت'' یہ ایک مختصر سا قصّہ ہے۔ یہ تو نہ ناول ہے اور نہ ہی افسانہ اوراس میں انھوں نے قصّہ در قصّہ ٹیکنیک کو استعمال کیا ہے۔ اس کا مرکزی خیال سماجی واخلاقی اصلاح ہے۔ برائی پر جیت اور اچھے برے میں تمیز ان کے قصّہ سے اجاگر ہوتا ہے۔ ’سرمایہ سعادت'' میں کشن پرشاد نے دو بھائیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس قصّہ کو آگے بڑھایا ہے۔ فریس اور شریف دو بھائی تھے۔ فریس اچھے اخلاق رکھتا ہے اور شریف بد اخلاق اور برائیوں کا شکار ہوجاتا ہے۔ دلاور بیگ بھی برائی کا شکار ہوجاتا ہے اور دولت کی خاطر اپنی بہن کو زہر دے دیتا ہے۔ اور یہ دونوں جیل کی سزا کاٹتے ہیں۔ برائی کا نتیجہ بھگتتے ہیں۔ اس کے بعد شریف میں بدلاؤ آجاتا ہے۔ شریف کی شادی خیرالنساء سے ہوجاتی ہے۔ اور فریس کی شادی شرف النساء سے ہوجاتی ہے۔ اس ناول کا اختتام طربیہ ہوتا ہے۔ آخر میں سب خوشی خوشی مل جل کر ساتھ رہنے لگتے ہیں۔ اس سے زندگی کے بارے میں مصنف کا نقطہ نظر بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ زندگی میں خیر نیکی کی فتح کے قائل ہیں۔ اس وجہ سے ان کا یہاں منفی کردار بھی آخر میں راہ راست پر آجاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کشن پرشاد مثالیت پسندی کا رجحان رکھتے تھے۔

حوالے

۱۔ ناول ''سرمایہ سعادت''، مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد، باراول، ۱۳۰۵ھ، 1887ء ص:3

۲۔ ایضاً، ص: 3

۳۔ ایضاً، ص: 4-5

۴۔ ایضاً، ص: 8

۵۔ ایضاً، ص: 8-9

۶۔ ایضاً، ص: 10

۷۔ ایضاً، ص: 9

۸۔ ایضاً، ص: 10

۹۔ ایضاً، ص: 10

۱۰۔ ایضاً، ص: 14-15

۱۱۔ ایضاً، ص: 16

۱۲۔ ایضاً، ص: 17

۱۳۔ ایضاً، ص: 17-18

۱۴۔ ایضاً، ص: 18

۱۵۔ ایضاً، ص: 21-22

۱۶۔ ایضاً، ص: 23

۱۷۔ ایضاً، ص: 23-24

۱۸۔ ایضاً، ص: 26-27

۱۹۔ ایضاً، ص: 28

۲۰۔ ایضاً، ص: 29

۲۱۔ ایضاً، ص:29

۲۲۔ ایضاً، ص:30

مطلع خورشید

مہاراجہ کشن پرشاد شآد کا پہلا ناول ''مطلع خورشید'' ہے۔اس ناول کوانھوں نے 1897ء میں لکھا ۔ یہ محبوب پریس علاقہ پیش کاری میں طبع ہوا۔اس ناول کومہاراجہ نے شرشار کے حیدرآباد آنے سے پہلے ہی لکھا تھا۔اس میں انھوں نے حیدرآباد کی تہذیب،نوابی انداز،خوش مزاجی،علاقائی زبان کو بیان کیا ہے۔اس میں مہاراجہ نے حیدرآباد میں اس وقت جوزبان استعمال ہوتی تھی اس کو پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ سیدھے سادھے الفاظ،محاوروں اور روزمرہ زبان اور بولی کا چٹخارہ بھی بیان کیا ہے۔ان کے یہاں حسن وعشق کے روایتی تصور موجود ہے۔مہاراجہ نے حیدرآباد کی تہذیب اور حیدرآباد کے مناظر کو پیش کر کے حقیقت نگاری کا ثبوت دیا ہے۔حیدرآباد کی بات چیت، چال چلن، رہن سہن، آداب واقدار،عیدوں وتہواروں، میلے، جلسے، ادبی مشاعرے،عروس، جاترے اور شادی کے رسم ورواج کو اچھے سلیقے سے پیش کیا ہے۔اس ناول میں اخلاقی نقطہ نظر کی اہمیت جھلکتی ہے۔ یہ ایک رومانی ناول ہے۔اپنے عہد کی معاشرت کے پہلوؤں کو مہاراجہ نے بیان کیا ہے۔اسی سے ان کے ناول میں زندگی محسوس ہوتی ہے۔اس ناول میں مختلف مصنفین کے تاریخی قطعات ملتے ہیں۔

یہ ناول 312 صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں مختلف ابواب ہیں جن کے الگ الگ عنوانات ہیں۔ ابتدائے عشق میں جوش جنون عشق، دل کی کچھ قدر کرتے رہنا،غصّہ کی بڑے تصویر جاناں دربغل، پرستان، آج تو خوب گلچھڑے اڑ رہے ہیں، ہائے اس عشق میں رونا بھی آسان نہ نکلا الفت کا یہ مزا ہے کہ ہوں وہ بھی بےقرار۔ رنگیلے شاہ، فتح گر۔ چٹ تری منگی پٹ ترا بیاہ۔

اس ناول میں ایک شریف گھرانے کی تہذیب کو پیش کیا ہے۔اس ناول کی ہیروئن خورشید آرا اور ہیرونواب مرزا مخمور ہیں۔ یہ دونوں مرکزی کردار ہیں۔زینت النساءاور پیاری بیگم خورشید آرا کی بہنیں ہیں۔

بڑی بیگم خورشید آرا کی والدہ ہیں۔ نواب مرزا مخمور کے دوست شیودت، فتح گر اور میاں کبڑے مرزا فرخ ہیں۔ اس کے علاوہ ضمنی کرداروں میں ماما، گارڈن، کوچمین، منسارام، پوربیا، اسمعیل، سکینہ، خاص پُز، فیضن، مہری، راوی، بہادر، رنبیر سنگھ، منجھلے، بہار، پری وغیرہ۔

اس کہانی میں حیدرآباد کی سماجی ومعاشرتی زندگی پس منظر کے طور پر جھلکتی ہے۔ مہاراجہ نے اپنے اردگرد کے زندگی کے تہذیبی وسماجی حالات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

قصّہ کچھ یوں ہے کہ خورشید آرا کی نظر انجانے طور پر نواب مرزا مخمور پر پڑتی ہے۔ خورشید آرا ایک شریف مہذب اور پردہ نشین خاتون ہے۔ غیر مردوں سے باتیں کرنا اس کے گھرانے میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ خورشید آرا نواب مرزا مخمور سے ملنے کے لئے بے چین رہتی ہے۔ مہتاب خورشید آرا کی خادمہ ہے اور بہار مرزا مخمور کی رازدار بن جاتی ہے۔، بہار ان دونوں کے خطوط کا ذریعہ بنتی ہے۔ خورشید آرا کی کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں۔ ادھر شیودت اور فتح گر مرزا مخمور کی مدد کرتے ہیں اور بہت سے مصائب کے بعد خوشید آرا اور مرزا مخمور کی شادی ہو جاتی ہے۔

مہاراجہ نے اس ناول میں چند محاوروں، کہاوتیں اور ضرب الامثال کو استعمال کیا ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ پیٹ سے پاؤں نکالے۔

۲۔ جان کا کالا ہونا۔

۳۔ اس عقل پر کالا وانا جلاؤ۔

۴۔ دمڑی کی ہانڈی گئی، کُتّے کی ذات پہچان کی۔

۵۔ سائیں کے سوکھیل۔

۶۔ دو ہاتھی پانی ڈباؤ ہے۔

۷۔ جھوٹی چاندی سونے کا لگاؤ نہ نام

۸۔ توڑے بھرنا اور بھاؤ بتانا۔

۹۔ موتی کی طرح آبرو تو نہ اتارو۔

۱۰۔ بُس میں چنگی ڈال جمال الگ کھڑی۔

۱۱۔ کچھ ٹوہ لگا کہ آنا۔

۱۲۔ آسمان میں تھگلی لگانا۔

۱۳۔ آسمان پر تھگلی لگانا، ہاتھیوں سے گنّے کھانا۔

۱۴۔ دس سِکھ سوسپاہیوں پر بھاری

مہاراجہ شادنے اس ناول میں تین بہنوں کا ذکر کیا ہے۔ تینوں ایک دوسرے سے مل جل کر رہتی ہیں اور ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتی ہیں۔ اقتباس دیکھئے۔

''خورشید آرا: کیوں بہن آج تم نے مجھے نام لیکر پکارا۔ کیا مرتبہ بزرگی کا یہی ہے۔

پیاری بیگم: سلام کر کے ہنستی ہوئی۔ بڑی تم کیسی ہو میں بڑی ہوں۔

زینت النساء: واہ واہ خوب کہی اے لو میں سب سے بڑی پھر دونوں اپنے آپ کو بڑی کہتی ہیں۔

خورشید آرا: ہاں بیوی تم ہی بڑی ہو ہم تمہارے روبرو کی چھوکریاں ہیں۔

زینت النساء: کیا شک ہے میں نے تمہیں گودوں کھلایا ہے۔

خورشید آرا: بس بس۔ اس وقت مزاج بدمزہ ہے نہ سر پکا۔

پیاری بیگم: کیوں خیریت تو ہے۔ اب رنگ لائی گلہری۔

خورشید آرا: اب تو بہت بڑھ کر باتیں بنانے لگیں۔ ابھی سے پاؤں سے پیٹ نکالے۔

زینت: اجی باجی جان ہوش کی باتیں کیجئے۔ پیٹ سے پاؤں نکالے

کہ پاؤں سے پیٹ نکالے۔[1]

اس ناول کا پلاٹ سیدھا سادہ ہے۔اس میں مہاراجہ نے حیدرآباد کے نوابی گھروں کی تہذیب اور بیگماتی زبان کو پیش کیا ہے۔انھوں نے معاشرے میں ہونے والے واقعات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ نواب کے گھر کی لڑکیاں اپنے خادمہ سے کس طرح پیش آتے ہیں مہاراجہ نے کرداروں کے ذریعہ بیان کیا ہے اقتباس ملاحظہ ہو:

''خورشید آرا بیگم نے ایک چھوکری کو آواز دی۔ مہتاب مہتاب اور مہتاب۔ اری کیا بہری ہے۔ دیکھوتو اس کی ڈھٹائی۔ کیا مرگئی۔ وہ نیند کی ماری بھلا سنتی کب تھی۔اس کی نیند بھاری تھی۔کوئی ڈنکا کیا معنی اگر دھونسا بھی بجاتا کب اٹھنے والی تھی۔ خورشید آرا نے جھلّا کر اس کے ایک لات رسید کی۔مگر وہ خبری نباشد۔صرف اتنا اثر اس لات کا ہوا کہ اس کی کروٹ اس ادلا بدلی سے خورشید آرا اور بھی جھلائی۔

زینت: جھونٹے پکڑ کر اٹھاؤ بہن۔

پیاری بیگم: مردوں سے شرئیط باندہ کر سوئی ہے۔''[2]

مکالمہ نگاری کے اعتبار سے یہ ناول کامیاب ہے۔کہیں کہیں مکالمے بہت طویل ہوگئے ہیں لیکن اس کو پڑھنے کے بعد کہیں بھی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔بعض جگہوں پر مکالمے مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ معنی خیز بھی ہیں۔کشن پرشاد نے کرداروں کے مکالموں کو جس طرح سے ادا کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے تجربات اور مشاہدات بہت گہرے ہیں۔ پڑھے لکھے کرداروں کے ذریعہ ادبی اور عالمانہ مکالمے ادا کرائے ہیں اور عام کرداوں کی زبان پر علاقائی اثرات نظر آتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''زینت: ہنسکر واہ بہن شریط کی ایک ہی کہی۔ کیا فصاحت ہے۔ پیاری ایک دن میں نے ماما سے کہا کہ رکیبوں میں الگ الگ آلو کا سالن لاؤ۔بس کسی کو موقع مل گیا۔ بہت بنانے لگی۔اعتراض یہ تھا کہ رکابی کہتی ہیں۔ رِکابیاں کہنا چاہئے۔یہ رَکیبیاں کیا معنی میں بگڑ گئی۔

میں نے کہا ہے ایک ذرا ہوش سنبھالو ابھی دنیا دیکھو، انھوں نے سو آدمیوں سے پوچھا۔سب نے یہی کہا کہ زنان خانے کی یہی زبان ہے۔دس اشرفیاں جیپوری مجھے دیں۔۔۔۔۔''

خوشید: وہ دیکھ تیری خالہ آئی ہے نکٹی۔

مہتاب: بل بل۔اس موئی چت بکری بلی نے تو میری ناک میں دم کر دیا۔نوچندی کے دن بی بی نے مجھے ملائی کا پیالہ دیا۔میں لے کر سلام کرنے جھکی۔ای اِتّے ہی میں کسی نے ایک نکوٹا مارا۔پہلے تو میں ڈر گئی کہ اللہ یہ بلا کہاں سے آئی دیکھا تو نکٹی۔اس وقت جو کہیں ملتی تو ٹانگیں ہی چیر کے دھر دیتی۔اب اس نگوڑی سے اور بھی دشمنا ہوگی۔''[۳]

حیدرآباد میں تھالیوں کو رِکابیاں کہتے ہیں۔روزمرّہ زندگی میں یہی علاقائی زبان استعمال کرتے تھے۔

مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ کا اسلوب سادگی سے بھرا ہوا ہے۔زبان پر ان کو عبور حاصل ہے۔اس ناول میں انھوں نے حیدرآبادی دسترخوان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''خورشید آرا: زینت النساء پری بیگم سے اگر کوئی پوچھتا کہ تم چھت پر چاندنی میں کھانا کھانا چاہتی ہو یا نیچے بڑی بیگم صاحب کے ساتھ کھانے میں بے تکلفی کجا۔مگر جانا پڑا۔گئیں۔مہری نے نعمت خانۂ مبارک میں فرش پر دسترخوان بچھایا۔سفید جیسے بگلے کا پر دسترخوان کے اردگرد سب بیٹھیں۔مہریاں سلفچی لائیں۔سب نے ہاتھ دھو کر اور بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کیا''[۴]

خورشید آرا دو چانوالے کھا کر اٹھتی ہے تو بڑی بیگم خورشید کی والدہ پوچھتی ہیں۔خورشید آرا مہذب لڑکی ہے۔وہ بڑوں کی قدر کرتی ہے اور ان کا کہنا مانتی ہے۔وہ بڑے ادب سے جواب دیتی ہے۔اقتباس سُنیئے۔

''خورشید آرا: امّی جان آج کچھ طبیعت بدمزہ ہے۔ بھوک تو نام کو
نہیں آپ کی تعمیل حکم کے لئے حاضر ہوئی''۵؎

اس زمانے کی تہذیب یہ تھی کہ اگر کوئی بڑا کھانے پر بلائے تو چھوٹے اس کی حکم کی تعمیل کرتے ہوئے دسترخوان پر حاضر ہوجاتے تھے اگر چہ کہ بھوک نہ بھی ہو۔

خورشید، زینت اور پیاری تینوں بہنیں پکوان کے بارے میں باتیں کرتی ہیں۔ ان کرداروں کے ذریعہ مہاراجہ نے حیدرآبادی پکوان کی چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ تینوں بہنوں کی گفتگو سیئے:

''خوشید آرا: شامی کباب تو ٹھنڈے ہوگئے تھے۔ مگر جو گرما گرم سیخ کے کباب آئے تھے وہ اچھے تھے۔

زینت: اے بہن تمہیں کچھ ہوش بھی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ آج کے کھانے میں کون سی چیز سب میں اچھی پکی تھی۔

پیاری: ہاں۔ بس میں بھی یہی پوچھنے کو تھی۔

خورشید: ہم کو سیخ کے کباب سب سے اچھے معلوم ہوئے۔

زینت: یہ سیم کے بیج جو قیمے میں پکے تھے۔ پلاؤ کو مات کرتے تھے اور باجی جان کو سیم کے بیج کے قیمے اور مرغ کا دو پیازہ مرغوب ہے۔

خوشید آرا: ہاں اور کیا۔ اکثر میں یہی پکواتی ہوں (مگر اف کہہ کر خموش نقش دیوار ہوگئی)۔

پیاری: کیوں آپا باتیں کرتے کرتے یہ اُف چہ معنی۔''٦؎

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں سیخ کے کباب سیم کے بیج کا شم پلاؤ وغیرہ مرغوب غذائیں تھیں۔

قسم کھانا بھی حیدرآباد کی تہذیب کی ایک اہم نشانی ہے۔ اگر کوئی بات نہیں بتانا چاہتے ہیں تو اس کو

قسم دے کر بات کہلواتے ہیں۔ یہ قسمیں کچھ خاص موقعوں پر ہی لی اور دی جاتی ہیں۔ حیدرآباد میں قسم کھانے کا رواج ہے۔ اس کی بہت اہمیت ہے۔ کسی کا واسطہ دے کر قسم دیتے ہیں جیسے حضرت عباس کی قسم، میرے سر کی قسم، آپ کو اپنی بیٹی یا بیٹے کی قسم، آپ کی والدہ کی قسم اور خدا کی قسم وغیرہ۔ قسم دے کر بات کیسے کہلواتے ہیں اقتباس دیکھئے:

''زینت: باجی تمہیں ہمارے سر کی قسم اب تو میں نہ چھوڑوں گی۔ تم ہزار داؤ دوگی بات ٹالوگی مگر میں ایک نہ مانوں گی۔ خدا کے لئے سچ سچ بتلا دو یہ کیا حال ہے۔۔۔

پیاری: حضرت عباس کی قسم وہی نہ ہو تو جو کہوں ہاروں۔ بیشک جو کہو سو ہاروں۔

زینت: اے ہے تو بہن کچھ کہوگی بھی۔ خدا کی قسم طبعیت الجھ گئی۔ کوئی پہلی بجھوائی ہو یا چیستان۔ خدا جانے کیا ہے کچھ تو کہہ دو (گلے میں ہاتھ ڈال کر) میری پیاری بہن میرے سر کی قسم کہو۔ وہ ایسا کون ہے جس پر تم لٹو ہو۔۔۔۔۔۔۔ خدا کی قسم میں قائل ہوں تمہاری عقل کی'' ؎

اس ناول میں کشن پرشاد نے خورشید آرا کے کردار کو سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ خوشید آرا اس ناول کی روح رواں ہے اور اسی کی وجہ سے ناول میں جان آجاتی ہے۔ انھوں نے خورشید آرا کی جذباتی اور نفسیاتی پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''خورشید آرا: ہاں بہن دیکھو، اول ہی ستم رسیدہ، دلدادہ، وہ آسمان ٹوٹا ہوا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میری مٹی برباد ہو جائے۔ ارے میرے کہاں نصیب۔ خدا جانے جب تک

میں رہوں یا نہ رہوں اور کیا کہا گزرے کی کچھ معلوم

نہیں ہوتا۔‘‘ ۸

تہذیب تعلیم سے پہچانی جاتی ہے۔تعلیم ہی سے انسان کو پرکھا جاتا ہے اس کے طور طریقے، رسم و رواج، بات چیت، رہن سہن سے اس کی تہذیب پہچانی جاتی ہے۔اس ناول کے ہیرو نواب مرزا مخمور ہیں۔ وہ تعلیم یافتہ ہیں وہ اپنے مذہب کے پابند بھی۔ جاگیردارانہ تہذیب کچھ نمونے ملاحظہ ہوں:

’’نواب: کیا فیضن ہے۔

فیضن: ہاں حضور باندی ہے۔

نواب: بآہ سرد، افسوس دن بھی نکل آیا۔خیر ادھر تو آؤ بی فیضن۔

فیضن: دروازہ کھول کر حاضر ہوئی۔اور جھک کر ادب سے مجرا (سلام) عرض کیا۔

نواب: نے آنکھوں کے اشارہ سے سلام کا جواب دیا۔اور فرمایا وضو کے لئے پانی لے آؤ۔فیضن وضو کے لئے پانی لائی۔نواب مخمور صاحب نے وضو کیا نماز پڑھی۔دوسری نازک بدن سیم تن چائے کی کشتی لے آئی اور روبرو میز پر رکھ کر ادب سے مجرا (سلام) عرض کیا۔سلام کا جواب دے کر بآہِ سرد روشن سے کہا کہ آج ہم چائے نہ پیں گے۔مزاج بدمزہ ہے۔اپنی کشتی لیتی جاؤ‘‘ ۹

اس ناول میں جذبات نگاری کے بھی اچھے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔انھوں نے اس ناول میں کئی طرح کے جذبات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔جس میں ہنسنا، رونا، خوشی وغم، غصّہ کرنا، رحم کرنا وغیرہ۔ نواب مرزا مخمور کے دربار میں ایک مرزا فرخ اور دوسرے میاں کبڑے۔میاں کبڑے اس لئے مشہور تھے کہ

ماں کے پیٹ ہی سے کمر خمیدہ دنیا میں سیر کرنے تشریف لائے تھے۔ان کی عمر پچاس سال کی ہے روتے ہوئے کو ہنسانا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ان کے کردا کے بارے میں مہاراجہ لکھتے ہیں:

''میاں کبڑے قوم کے خان زی پٹھان،نیکلی پگڑی بر سری انگرکھا اور نیم آستین در بر اور ایک پرانی تلوار بغل میں چڑھائے جوتا پاؤں میں مزاج کے تیکھے اور خوش مزاج ایسے کہ روتے ہوئے کو ہنسانا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔''۱۰

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد اس ناول میں فارسی زبان کا بھی استعمال کیا ہے۔میاں کبڑے اکثر فارسی زبان میں بولتے رہتے ہیں ان کی اس زبان سے سب کو ہنسی آجاتی ہے نواب میاں کبڑے کو روکتے رہتے ہیں اور ان کو اردو میں بات کرنے کو کہتے ہیں۔مگر میاں کبڑے نہیں مانتے وہ یوں جواب دیتے ہیں:

''میاں کبڑے: نانا،نانا۔حضور اردو زبان مادر من کہ زوجۂ مکرمۂ پدر بزرگ من بودندے۔ہندوستانی نبودن می شود،ایرانی می شود۔شما بہ بیند کہ گال اور دین او قاتہاے پیری اس قدر لال بھبوکا است کہ از بوٹ نری استر شما بہتر و سرخ ترقی شود،نام زوجۂ من۔نانا غلط گفتم۔نام زوجۂ پدر ما (بیر بھبوٹی ست) آن والدہ من است نہ زوجۂ من کہ از غلط گفتم''

۱۱

نواب کے دربار میں باندیاں اور رقص کرنے والیاں بڑے ادب و احترام سے درباریوں کو گلوریاں دیا کرتی تھیں۔یہ بھی تہذیب کی ایک نشانی ہے۔دربار میں فیضن اور کبڑے کی گفتگو سُنیئے:

''فیضن: گلوریاں لائی تھیں۔غل کی آواز سن کر دوڑ آئی تو دیکھا میاں کبڑے دل لگی میں بگڑے ہیں۔فیضن ہنسکر اے وہ بڑا ہَو۔اماں جان کو اِدھر اُدھر چرائی کو بھیج رہے ہو۔جیتے رہو برخوردار۔اچھی سُبھہ گھڑی ماں کے پیٹ سے نکلے تھے۔تمہاری اماں سنیں تو

بڑی خوش ہوں۔

کبڑے: (بگڑ کر) برخوردار کہتی ہو۔ ابّا جان نہیں کہتی ہو۔

فیضن: اچھا ابّا جان سلام تمہارے داماد نے یاد کیا ہے۔ کہا کئی دن ہوئے بی سالی کو نہیں دیکھا۔ سہلیچ کو نہیں دیکھا۔

روشن: اے بڑُ ہوُ، تمہیں زبان سے بھی لینا نہیں ہے۔ ہمارے ابّا بنتے ہوتو ہمارا میاں تمہارا داماد ہوا کہ نہیں''۱۲؎

لباس تہذیب کا ایک مظہر ہے۔ لباس کے ذریعہ تہذیب آسانی سے پہچانی جاتی ہے۔ گلزار محل میں ایک لڑکی عمدہ لباس پہنے ہوئے کسی کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ اس کے بارے میں مہاراجہ لکھتے ہیں:

''اس مکان میں وہ نازنین پری پیکر جادو نظر، غیرت وہ یوسف سرو قامت کشیدہ قد قوس ابرو دہانی رنگ کی مخمل کی کرتی زیبِ تن عمدہ قیمتی چینی المس کا پائجامہ اور بیش بہا دوپٹا جس کے وزن سے ہر قدم پر بوقت خرام کمر لچکتی اور سینکڑوں بل کھاتی تھی کسی کے انتظار میں بیٹھی ہے اور ہر وقت یہ کہتی جاتی ہے۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

۱۳؎

اس دور میں حیدرآباد میں پردے کا خاص رواج تھا۔ مسلم گھرانوں میں اس پردہ کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ جوان بیٹیاں اپنے والد کے سوائے کسی کے سامنے پردہ کئے بغیر نہیں جاتی تھیں۔ اس دور میں زنان خانے اور مردان خانے الگ الگ ہوتے تھے۔ خورشید، زینت، پیاری اور بہار ہوا کھانے کے لئے باغ کو جاتے ہیں وہاں اچانک ایک بوٹ آتا ہے۔ اور یہ تینوں بہنیں گوشے میں ہوجاتی ہیں۔ مہاراجہ پردہ کے

بارے میں لکھتے ہیں:

''دل بہار جو راز سے واقف تھی کہا اے ذرا چپ رہو تو رہئے دیکھئے سامنے سے وہ بوٹ کیسا آتا ہے۔ وہ اُتّر کی طرف سے پردہ گوشہ ہو جائے۔

زینت: ہاں سچ تو ہے وہ کیا آ رہا ہے۔

پری: دیکھوں ہمیں تو بوٹ ووٹ موا کچھ بھی نہیں سوجتا۔

دلہن: اے باجی اندھیر کرتی ہو۔ یہ بھی کوئی موئی سوئی ہے یہ تو وہی مثل ہوئی کہ دن کو اونٹ اجیاری رات کو آسمان اور اندھیری رات کو تارے نہیں سوجھتے۔۔۔۔۔۔

نواب صاحب دھم سے کشتی کے اندر موجود۔۔۔۔۔خورشیدی بیگم کے سوا اور سب نے آنچل سے منہ ڈھانپ لیا''[۱۴]

نواب صاحب اپنے مذہب کے اصول کے پابند تھے۔ ان کے صبح کے معمولات سے ان زمانے کی جاگیردارانہ تہذیب جھلکتی ہے اقتباس دیکھیے:

''خیر شبکو نواب صاحب نے آرام کیا۔ صبح اٹھتے ہی منہ دھو کر اصلاح بنوائی۔ منہ ہاتھ دھو یا حمّام کیا۔ وضو کر کے نماز پڑھی۔ وظیفہ پڑھا، لباس بدلا، آج روز سے ذرا قیمتی جوڑا پہنا تولہ والہ عطر موتیا مَلا۔ جس کی خوشبو سے دیوڑھی بھر مہک گئی۔ دیوان خاص تشریف لائے سلام ہوا۔''[۱۵]

مسلم گھرانوں میں لوگ منّتیں مانگتے تھے اور جب منّت پوری ہو جانے کے بعد درگاہوں کو جا کر فاتحہ دیتے تھے۔ فقیروں کو کھانا کھلاتے تھے۔ نواب کے منّت کے بارے میں مہاراجہ لکھتے ہیں:

''نواب مخمور نے منّت مانی تھی کہ اگر خورشیدی سے ملنے کی کوئی عمدہ

سبیل نکلے گی تو حضرت پیرانِ پیر دستگیر شیخ عبدالقادر جیلانی محبوب سبحانی قدس سرہٗ الشریف کی گیارھویں کرونگا۔ شب کو تالاب سے واپس آتے ہی مرزا فرخ کو لپٹ گئے اور کہا مرزا فتح نے کہا مبارک مبارک۔ مگر بتایئے تو یہاں وحشت ہورہی ہے۔ مرزا نے مختصر طور پر حال سن کر کہا حضور غلام کی تو رائے ہے کہ گیارھویں کل ہی ہو۔ طائفوں کا بندوبست قدوی کے تعلق فرمائے۔ فرش اور روشنی کا انتظام داروغہ فراش خانہ کریں او کھانے کا انتظام حضوری خاص پُز بُر ہان صاحب نعمت جنگ کی نگرانی ہو۔ نواب صاحب نے منظور کیا اور اسی وقت سے بندوبست کے لئے ہرکارے دوڑائے گئے۔ ۱۶؎

اس میں مہاراجہ نے حیدرآباد کی باورچیوں اور پکوان کے بارے میں بیان کیا ہے۔ نواب، بھورے اور باورچی کی گفتگو سُنیئے:

''بھورے نورے نواب نے اپنے دوست سے کہا بھئی اپنا باورچی ایک دن کے لئے کل تو نہیں پرسوں ہم کو دو۔ ہم نے ایسی شبدیگ نہیں کھائی۔ تقصیر کہ شلجم اور کباب اور گوشت ایک طرح کے ہوں۔ معروضہ یہ ہے تقصیر کہ ہمارے ملک میں شلجم کی چیزاں لوگاں کم کھاتے ہیں۔ میرے شبدیگ پکانا لکھنو کے ایک خاص پُز نے سکھائی تھی۔ اس سے بھی اچھی پکتی۔ باورچی خانے میں میرے کو پکانے کا جی نہیں چاہا اور باورچی دیکھ کے ترکیب نہ سیکھ لیں۔ وہ خالی خولی سالنان جانتے ہیں جو ماما پکالیتی ہے کویلوں میں جہاں پکانا ہوا دھواں بہت آتی ہے۔ ان کھانوں کو بہت سا دولتان ہونا۔ ایک پلّہ چاولان کو گھی ہونا دوسو حالی کا جس سے رئیس سے ایسا بولو وہ کہے نکو۔ اسی با سبب کویلوں میں شبدیگ پکائی کہ کوئی باورچی مار کے سیکھ نہ جائے بند کر کے پکایا ہوں۔ اب سب

بیٹھے منہ دیکھتے رہے۔خاصہ تناول فرما کربیس دانی سے ہاتھ دھوئے۔‘‘

۱۷

مہاراجہ نے اس ناول میں علاقائی بولی کے الفاظ کو استعمال کیا ہے۔ ہر علاقے میں زبان پر علاقائی اثرات ضرور ہوتے ہیں اسی کو انھوں نے ناول میں پیش کیا ہے۔

چیزاں	:	چیزیں
لوگاں	:	لوگ
میرے کو	:	مجھے
سالنان	:	مختلف سالن
دولتاں	:	دولت
چاولان	:	چاول

محفلیں، رقص، سرود، گانا بجانا، غزل گانا بھی تہذیبی مظاہر ہیں۔ محفلوں میں غزل، قوالی، شعر، درگاہوں میں قوالی گانا بھی تہذیب کی نشانی ہے۔ نواب کے دربار میں 9 بجے تک محفل رقص و سرود ہوتا ہے اور محفل میں یہ غزل پڑھی جاتی ہے۔

دل اپنا بتوں کا ہوا چاہتا ہے
پرستان یہ کعبہ ہوا چاہتا ہے
دل اپنا بنے گا گھر ایک شوخ بت کا
یہ کعبہ کلیسا ہوا چاہتا ہے
مری جان جاتی ہے اک مہ لقا پر
خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے
وہ دل جس کو پالا تھا تاروں سے ظالم
شہید ایک ادا پر ہوا چاہتا ہے
گواہی یہ دیتا ہے دل اپنا عاشق

کہ عشق سنولیا ہوا چاہتا ہے
گواہی یہ دیتا ہے دل اپنا عاشق
کہ عشق سنو لیا ہوا چاہتا ہے۱۸؎

مہاراجہ نے اس ناول میں مسجع ومرقع زبان کوبھی استعمال کیا ہے۔زبان پران کوقدرت حاصل ہے۔اقتباس دیکھئے:

''شامیانہ عشرت کا شانہ، اور امیر گردوں سریر صاحب خانہ، نازک مزاج طبیعت شاہانہ،خوش لباس وضع مردانہ،علم موسیقی اوستاد زمانہ،فن و سخن میں یکتاو بیگانہ، اہل آبرو سے یارانہ،علم وشمع کا پروانہ، بوئے عنبر بار زلف، قیرآ گین کا دیوانہ،مگرفسق وفجور سے بیگانہ،صاحب دیوان و فسانہ،وقت پرتسبیح زمرد ہزاردانہ، ہمیشہ محفل سے دورگلابی پیمانہ،دل سفا منزل صوفیان ماضی کا کاشانہ، شام کورقص و چنگ و چغانہ، مے سے زبان صرف استغفراللہ،لب ملامت شیخان گمراہ''۱۹؎

اس ناول میں مہاراجہ نے واقعات اورجگہوں کواس طرح سے بیان کیا ہے کہ قاری کوایسا لگتا ہے کہ وہ خوداپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔نواب کے دربارمیں محفل سجائی جاتی ہے۔یہ محفلیں نواب کے دربار میں محفلیں کیسی ہوئی تھیں ان کی عکاسی کا بیان دیکھئے۔

''محفل میں فرش مکلّف بیش بہا،گلکاری کئے ہوئے ایرانی قالیچے،قیمتی رنگ برنگ قالیچے،امراءنام دار کے لئے کئی کاشانی مخمل کے مسند تکئے، گاؤ تکیئے، بہاری کارچوبی سچّا کام،جھوٹی چاندی سونے کا لگاؤ نہ نام، رات رشک لیلتہ القدر، غیرت لیلتہ القدر، روشنی کا پورا انتظام۔شک ہوتا تھا کہ یہ محفل ہے یا شب عروسی کا اہتمام۔شامیانے کی چوبوں میں پھولوں کے گجرے، موتیے کی بہار۔کہیں ناگسیر کے پھول خوشبودار، پیچوان گڑگڑی کے حُقّے قطار درقطار،لکھنو کا دوسرا تنبا کو

مشکبار، مگر صحبت رنگین مزاج احباب کی دم میں نمد، شیخ و شباب کی جب
مہمان ذیشان جمع ہوئے طائفے بلوائے گئے۔'' ۲۰؎

حیدرآباد میں بیگموں کے گھر مامائیں اور خادمہ ہوا کرتی تھیں۔ اور گارڈن اور کوچمپن بھی ہوا کرتے تھے۔ گارڈن گھر کا پہرا دیتی تھیں۔ مامائیں کھانا پکاتی تھیں اور گھر سنبھالتی تھیں۔ خادمہ گھر کے سارے کام کرتی تھیں۔ خورشی، زینت اور پیاری باغ کی سیر کو جا کر گھر کو دیر سے لوٹتی ہیں تو بڑی بیگم ان کو ڈانتی ہیں اور ماما کو کھانا دینے سے منع کرتی ہیں مگر مامائیں بیگم کے بچیوں کو اپنی اولاد سمجھتی تھیں ان کا کھانے، پینے کا خیال رکھتی تھیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''گارڈن اپنے پہرے پر گئی اور بڑی ماما کو جگا کر کہا کھانا گرم کر کے چپکے سے خاصہ صاحبزادیوں کو کھلا دو۔ ماما خوش ہوگئی کہ خیر گو دیر میں آئیں مگر آئیں تو جلدی سے اٹھ کر کھانا گرم کیا اور خاصہ اور دو چھوکریوں کو دیگچیاں اور خوان لے کر او پر گئی۔ ہاتھ دُھلایا۔ زبردستی دسترخوان میں بٹھایا۔'' ۲۱؎

اس کے علاوہ مہاراجہ حیدرآباد کے دسترخوان کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''مچھلی پکی تھی۔ پراٹھے تھے۔ آلو کا سالن، امباڑے کی بھاجی خشکا اور مرغ کا قورمہ، چٹنی، اچار، مربّا، جس سے جس قدر کھایا گیا تھوڑا بہت کھایا گیا اور ہاتھ دھو کر گلوریاں کھائیں۔ نیند کہاں مگر جب رات بھیگی تو ذرا پلک لگ گئی۔ مثل سچ ہے کہ جھونکے نیند کے سولی پر آتے ہیں۔'' ۲۲؎

خورشید، زینت اور پیاری جب گاڑی میں بیٹھ کر سواری کرتے ہیں اور آپس میں باتیں کرتی رہتی ہیں حیدرآباد کے محلّوں کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں مہاراجہ نے کرداروں کے ذریعہ حیدرآباد کا پس منظر اور محلّوں کے بارے میں لکھا ہے۔ اس سے اس وقت کے محلات، باغات اور دوسری عمارتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''بہار نے آگے بڑھتے ہوئے کہا لال باغیں ہیں۔ یہ رزیڈنسی ہے، یہ

انگریزی تھانہ ہے۔ رگھورام کا باغ، افضل گنج کا پل، مغل کا ہوٹل، دیوان کی دیوڑھی، مچھلی کمان، چار کمان، گلزار حوض، چار مینار، مکّہ مسجد، پنج محلّہ، شادی خانہ کا دروازہ، شاہ جہاڑو کا تکیہ، شالی بنڈہ، راجا رائے رایاں کی دیوڑھی، نانک باؤلی، ناگول، چنتال، لال دروازہ، راجنّا کی باوڑی، راجا رائے رایاں کا باغ''۔۲۳

مہاراجہ کشن پرشاد نے حزنیہ، سنجیدہ اور مزاحیہ تینوں طرح کے کردار اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے مزاحیہ انداز اور ہنسی مذاق کی باتیں بیان کی ہیں۔ نواب فتح گر اور مسخرہ کی گفتگو سُنیے:

''فتح گر: اجی تم دیکھتے جاؤ بھائی کہ تمہارا شکست گر کس پہونچ کا آدمی ہے۔

مسخرہ: آسمان پر تھگلی لگانے والا چڑیا دودہ لانے والا۔

فتح: تو اپنے مسخرے پن سے باز نہیں آیا تو چڑیا کا تیرا باپ چڑیا کا۔

مسخرہ: ارے بھائی چڑیا کا دودہ کہا۔ تم کو چڑیا کا نہیں بنایا۔

نواب: (مسکرا کر) اجی وہ تم دونوں چڑیا کے سہی۔ ہمارا کام نکلے تو جانیں۔

فتح: ارے بغل میں لاکے اگر بیٹھا نہ دوں تو سہی

ہے کور کھے جو نہیں رکھتے ہیں نظر ہم
اڑتی ہوئی چڑیا کے بھی گن لیتے ہیں پر ہم

مسخرہ: اب تو چڑیا کے ہوئے۔

نواب: روتے کو ہنسانا ہے ظالم۔

مسخرہ: جی روئیں تمہارے دشمن''۲۴

کشن پرشاد نے اس ناول میں بے شمار کرداروں کو پیش کیا ہے ہر کردار اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔

انھیں کرداروں کے مسائل ان کی الجھنیں ان کے غموں اور خوشیوں سے اس ناول کے واقعات ابھرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس ناول میں روزمرہ زندگی میں ہونے والے حادثات، محبت، حسد، رقابت، انسانی فطرت، بحث وتکرار، بڑوں کا ادب واحترام، عزت ووقار اور بہنوں کے آپس کے جذباتی رشتے اور شرم وحیا، خاندان کی عزت کے بارے میں تفصیل سے سادہ اور سلیس زبان میں لکھا ہے۔ ماما ئیں۔ خواص، سکینہ بیگم، بہار، خورشید آرا، مہتاب، راوی بی بی، شیودت، فتح گر، مسخرہ، مرزا مخمور، میاں کبڑے، خاص پُز، گارڈن وغیرہ کے کرداوں کے ذریعہ ناول کو آگے بڑھایا ہے۔

اس ناول میں مہاراجہ نے جگہ جگہ پر اردو اور فارسی اشعار کو بھی استعمال کیا ہے۔ اس دور میں حیدرآباد میں لوگ اولیاء، بزرگوں سے عقیدت رکھتے تھے۔ پیر، فقیر، بزرگوں کی بات مانتے تھے۔ رنگیلے شاہ ایک فقیر بن کر آتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ایک پیر مردسن کی سی داڑھی، سرخ وسفید بہت بوڑھا بھوئیں تک سفید کفن پوش آیا اور خورشید سے ہم کلام ہوا۔ بچّہ تیرا مطلب جلد نکلے گا۔ گھبرا مت بس اس شعر کو ورد زبان کر۔
>
> بہ گلشن عندلیباں راسحر گہ درفغاں آرو
>
> دلِ غمدیدہ ام ہر گہہ کہ ہمراہِ سخن گرو۲۶

جب خورشید آرا کے بھائی (منجھلے) کو اس بات کا پتہ لگتا ہے کہ وہ نواب مرزا مخمور سے محبت کرتی ہے تو بڑی بیگم (خورشید کی والدہ) چپ کے سے اس کو وہاں سے دوسرے مقام پر یعنی مشیر آباد کو لے جاتی ہے۔ اِدھر نواب مخمور پریشان ہوتے ہیں ان کی پریشانی کو دور کرنے کے لئے نواب کے دوست واحباب ایک تدبیر سوچتے ہیں اور فتح گر بھیس بدل کر وہاں جاتے ہیں۔ خورشید کو جس مقام پر ٹھہرایا گیا تھا اس کا نام رنگیلہ بنگلہ تھا۔ وہاں پر ایک خاص جگہ بھی مشہور تھی جس میں رنگیلے شاہ کی مزار تھی۔ اور ہر سال میلا ہوا کرتا تھا۔ میلے، عروس بھی تہذیب کے اہم مظہر ہیں اقتباس دیکھئے:

> ''رنگیلے شاہ ایک درویش کامل رسیدہ، خداشناس وخدا آگاہ، عارف باللہ، ولی اللہ کا یہاں مزار تھا اور ہر سال شروع فصل بہار میں یہاں ایک

مہینے تک آٹھویں دن میلے ہوا کرتے تھے۔ ان کے جدِ امجد کئی پشتیں
ہوئیں خواجہ عثمان ہارونی کی بیعت لائے تھے اور اپنے دلی حق آ گاہ
قدس سرہ شریف کی خدمت سے عظمت پائی تھی۔ ان میلوں میں اجمیر
شریف اور دیوار شریف اور رُدولی شریف اور دور دور سے فقرا اور علما اور
مشائخ کبار اور صوفیان صافی اور قوال اور ارباب نشاط اور اہل دل اور
تماش بین جوق جوق جمع ہوتے تھے۔ اس درویش بزرگ ومقدس کے
کمالاتِ ظاہری و باطنی صوری ومعنوی میں سے کمال یہ بھی مشہور تھا کہ
وصال کے دو روز قبل اپنے مریدوں سے یہ کہہ گئے تھے اور میت کر گئے
تھے کہ میرے مزار کے سرہانے یہ شعر کندہ ہوے۔

ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہے
یہ سب کچھ ہوا ہم اکیلے رہے

اور پائنتی یہ دو مصرعے ہوں

اسلام اے بعد ما آئندگانِ رفتنی
برشما خوش باد ناخوشہائے دنیائے دنی''۲۷

کشن پرشاد شاد نے اس ناول کو فطری انداز میں لکھا۔ اس ناول کا پلاٹ مربوط ہے۔ اس میں جذبات نگاری اور منظر نگاری عمدہ ہے بڑی بیگم تو ہم پرست تھیں وہ روایتی اقدار کو بہت مانتی تھیں۔ فتح گر بھیس بدل کر بڑی بیگم سے جو کہتے ہیں وہ بڑی بیگم ان کی باتوں کو مانتی ہیں۔ بڑی بیگم کو فتح گر کی باتوں پر پکا یقین ہو جاتا ہے۔ فتح گر سفید کپڑے پہن کر آتے ہیں اور خورشید سے یہ کہہ کر جاتے ہیں کہ تم بڑی بیگم جیسا کہتی ہیں ویسا کرو گھبرانہ مت۔ خدا سب کی مدد کرتا ہے۔ اور نواب کا کوئی خط یا نشانی ہمیں دو تا کہ ہم نواب کو دکھائیں۔ یہ سن کر خورشید آرا بہت خوش ہو جاتی ہے اور خط دیتی ہے۔ خط لے کر فتح گرہ (رنگیلے شاہ) نواب کے پاس جاتے ہیں اور نواب کا اجڑتا ہو گھر بچالیا۔

اس دور میں بادشاہ کی سواری نکلتی تھی تو لوگ راستے سے ہٹ جاتے تھے۔ اور عورتیں پردہ کیا کرتی

تھیں۔ اور یہ بھی مانتی تھیں کہ اگر کوئی بادشاہ کی سواری دیکھ لے تو اس کے من کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد میر محبوب علی خاں کی سواری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ادھر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی اور کسی نے زور سے پکارا۔ او جھٹکے والے بازو سے بازو سے یہ سنتے ہی اس مہوش شوخ وشنگ رشک پری خان فرنگ نے ایک طرار بھرا اور چق کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ چق اٹھا کر بے حجاب برافگندہ نقاب سڑک کی طرف جھانک سواری دیکھنے لگی۔ پہلے ایک سوار حبشی اس کے بعد دو حبشی سوار اس کے بعد جوڑی گاڑی نہایت ہی بیش بہا عربی گھوڑے، سرنگ کنوتیاں بدلتے ہوئے جاتے تھے۔ بنے ہوئے دونوں کے کلفیاں لگی ہوئی، سائیس بھی زرداز رد، گاڑی کی گدیوں کے غلاف بھی زرد مخملی یہ شاہ آصف جاہ ہز ہائنس میر محبوب علی خاں خلد اللہ ملکہ و دولتہ فرمان روائے ملک دکن کی سواری باد بہادری تھی۔ خورشیدی بڑی بیگم کھڑی ہی رہی۔ بادشاہ نے ادھر دیکھا تو اس پری نے بصد ناز دلبری جھک کے سلام کیا۔ حضور بندگان عالی نے بطیّب خاطر وکشادہ پیشانی جواب دیا۔ گاڑی کے پیچھے پانچ حبشی سوار اور گاڑیوں کا تانتا۔ امرا اور ایڈیکانگ اور سول اور فوجی افسر اور شاگرد پیشے کے لوگ تھے۔'' ۲۸

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد اس ناول میں شادی کے رسم ورواج کو تفصیل سے لکھا ہے۔ بڑی بیگم خورشید آرا کی شادی کی تیاریاں کرنے لگتی ہیں۔ شادی کی تیاریاں بڑے دھوم دھام کے ساتھ ہونے لگتی ہیں۔ شادی کی تیاریوں کی تفصیل ملاحظہ کیجئے۔

''گوٹے والے سنہری رپھلی لچکا بنت گوکھرو، چمپا، چٹکی، گوٹا۔ بانکڑی، کرن لئے چلے آتے ہیں۔ کامدانی کے تھان دوپٹے کرتیاں دکھائی جاتی ہیں۔ زربفت کمخواب، مشروع گلبدن، اطلس، ساسرلیٹ دیائی دکھائی

جاتی ہے۔ سُنار قطار در قطار بیٹھے ہوئے چاندی سونے کے برتن بنا رہے ہیں کہیں مینا ہو رہا ہے کہیں کندن۔ باریک چاول دور دور کے شہروں سے آتا ہے اور ہر قسم کے غلّے اور شکر اور چینی اور قند اور مسالے اور اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کے گھی کا انبار لگایا جاتا ہے۔ کیوڑے گلاب کے قرابے کے قرابے بھرے جاتے ہیں۔ قنوج، جونپور، لکھنو سے فرمائشی عطر بڑا قیمتی چلا آتا ہے۔ بسواں لکھنو، بنارس، فیض آباد سے تمبا کو کے کشیدنی و کوردنی کے پارسل پر پارسل آ رہے ہیں کٹک کے سُنار چاندی کا کام بنانے کے لئے بلوائے گئے ہیں۔ غرض شادی کا سامان پورا لیس ہے۔'' ۲۹

ادھر خورشید آرا دلہن بن کے بیٹھتی ہیں۔ اس کی بہنیں اور مامائیں اس کی بلائیں لیتی ہیں۔ اور خورشید آرا کو مبارک باد دیتی ہیں۔ خورشید آرا مہذب ہیں۔ بڑوں کا احترام و عزت کرتی ہیں۔ ماں باپ کی خوشی کو ہی اپنی خوشی سمجھتی ہیں۔ جب بڑی بیگم خورشید کو بلاتی ہیں تو وہ آ کر یوں جواب دیتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''بیگم صاحب نے خواص بھیج کر خورشیدی کو بلوایا۔ یہ سنتے ہی کہ سرکار نے یاد کیا ہے باچھیں کھل گئیں اور جھٹ پٹ دوڑی آئی۔ جھک کر آداب بجالائی ہے او قدموں پر گر کر رونے لگی۔ بڑی بیگم نے گلے سے لگایا پیار کیا او کہا بیٹا وہ صبح گھڑی جلد آنے والی ہے کہ تم دلہن بنی ہو گی۔ سُکھپال پر سوار ہو کر آگے آگے دولھا کا عربی گھوڑا پیچھے پیچھے تم دلہن بنی ہوئی باجا بجتا ہوا سسرال جاؤ گی۔ خورشیدی نے سر جھکالیا'' ۳۰

حیدرآباد میں چند کاموں کو منحوس مانا جاتا ہے جیسے کالی بلّی کا سامنے آجانا، چھینک دینا، بیوہ عورت کا منہ دیکھنا وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح برات میں کسی نے چھینک دیا اس کو بدشگون (منحوس) مانا جاتا ہے۔ بدشگونی اور توہم پرستی کی جھلک دیکھئے:

''بہادر مرزا کو پورا یقین ہو گیا کہ مخمور نکالا گیا۔ اور رقص وسرود اور ناچ رنگ پانچ مرادانے دوزنانے طائفے ٹکے ہیں۔ دھما چوکڑی مچی ہوئی ہے۔ اب برات کا دن آیا۔۔۔۔ رنبیر سنگھ اونچی بنے پنچے کی جوڑی کل پر چڑھی ہوئی عباسی ہاتھ میں بڑے خوش شام کو توشہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا (آچھین) ارے! شگون بد ہوا۔ کسی نے ج چھینک دیا۔ بُرا ہوا۔ بہادر مرزا کے جھک کے رنبیر سنگھ کے کان میں کہا یار شگون برا ہوا۔ چھینک پڑی۔ رنبیر سنگھ نے کہا پاگل ہو ہم چھتری لوگ چھینک سُسرے کی ناک اڑا لیں''۔ ۳۱

اِدھر فتح گرا اپنے دوستوں کو لے کر برات میں پہنچتا ہے۔ اور بدشگون کا فائدہ اٹھا برات میں بہت سے کارنامے انجام دیتا ہے۔ دولہا کو گھوڑے پر گرانے کی تدبیر سوچتا ہے۔ فتح گرا ایک جا گیر کو لالچ دے کر اس کو اپنے ساتھ کر لیتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''باجا بجتا ہوا برات چلی جاتی تھی کہ ایک چوڑی موری آئی اور گھوڑا پھاندا۔ سائیس تو جا گیر کے لالچ سے ملا ہوا تھا ہی اس نے گھوڑے کی کل دبائی تو گھوڑا اور سوار لَد بَد، تلے اوپر شملہ وہ گرا جیغہ کہیں، سرپیچ کہیں، گھوڑا لنگڑا دیں اور نوشہ گھوڑے کا زین ضعیف الاعتقاد آدمیوں کو تو پورا یقین ہو گیا کہ چھینکے کا اثر تھا اور دل لگی یہ کہ چھینکا فتح گر کے ایک آدمی نے تھا۔ جس کو نک چھینی لے کر اس نے بھیس بدلا کر بھیجا تھا۔ اب نوشہ تو غش میں پڑا ہے۔ گھوڑے کی دوا درمن ایک چابک سوار کر رہا ہے اور سائیس کو خاصہ ہٹا کٹا مگر ٹانگ پکڑ کر روتا ہے کہ ہڈی پر بڑی چوٹ آئی۔ برات ٹھٹک گئی۔ پشانے والے بھاگے چلے جاتے ہیں۔

جوان جوان پُشانے والیوں کو یار لوگوں نے چھیڑنا شروع کیا۔

وائے بے دردی کوئی تاپے کسی کا گھر جلے'' ۳۲

فتح گراوران کے دوستوں کی حرکت سے دولہا گھوڑے پر سے گر کر بے ہوش ہوجاتا ہے۔ جب بڑی بیگم کواس کا پتہ چلتا ہےتو ان کوفتح علی شاہ کی باتیں یاد آتی ہیں اوروہ اپنے گھر والوں سے کہہ دیتی ہیں کہ جلدی اسی وقت دوسرے دولہا کا انتظام کرو۔ کیونکہ بڑی بیگم کوفتح علی شاہ کو پیر مرد فقیر سمجھی تھیں اورتو ہم پرست تھیں۔ اِدھر یہ بات مرزا مخمور تک پہونچی تو وہ دولہا بن نے کے لئے تیار تھے کیونکہ سب ان کی ہی سازش تھی کہ خورشید آرا سے ان کا نکاح ہوجائے۔نواب مخمور کے گھر پیغام جاتا ہے۔اقتباس دیکھئے:

''تھوڑی دیر مراقبہ میں گئے اور کہا حکم معبود یہی ہے۔اسی وقت پیغام گیا۔نواب کی والدہ اور بہنوں اور پھوپھی نے منظور کیا۔وقت کم رہ گیا تھا۔مہندی کی رسم اسی وقت ادا کی گئی۔ساچق بھی چٹکیوں میں گئی۔ دوسرے روز دعوت کے رقعے تقسیم ہوئے۔''۳۳؎

خورشید آرا کی شادی کا پیغام سنتے ہی نواب مرزا مخمور خوشی سے جھوم اٹھتے ہیں اوران کے دوست شیبودت جشن منانے لگتے ہیں۔سب مل جل کر خوشی سے دوسرے دن خورشید آرا کے ہاں برات لے جاتے ہیں اقتباس ملاحظہ ہو:

''شیبودت کے ہاں جشن مندی، نواب نوشہ مخمور نے چوٹی کے طائفے بلوائے۔ چٹ تری منگنی پٹ تیرا بیاہ دوسرے روز برات گئی۔ برات بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ اس قرینے سے دلہن کے مکان گئی۔سب کے پہلے نشان کا ہاتھی۔حضوری فیل خانہ مبارک کا مست کنجل، اکڑتا جھومتا جانے لگا وہ مست کنجل۔ ہاتھی جھومتا بھلا۔اس کا نام نوبت پہاڑ تھا۔ مستک پر سیندور کا رنگ اور کچھ نیلا پیلا جھول زرد، فیلبان زرد از زرد۔ دو چرکٹے ہمراہ ایک سونڑ کے اِدھر ایک اُدھر۔ہاتھی کے ایک پاؤں میں بھاری زنجیر آگے آگے دس بلّم بردار، زرد وزی نشان۔ پھریرا اوڑ رہا تھا جھنڈے پر نصر من اللہ فتح قریب''۳۴؎

ہر مذہب کے لوگ اپنے مذہبی رسوم انجام دیتے ہیں۔مسلم شادی کے رسم و رواج الگ اور

ہندوؤں کے رسم ورواج مختلف ہوتے تھے۔نواب نوشہ مرزا مخمور کے لباس اور برات کی تفصیلات دیکھیے :

''دولہا سرخ وسفید نہایت خوش رو کلائی شیر نر کی سی، کمر چیتے کی سی ہاتھ پاؤں سڈول، خوبصورت بھاری خلعت، قیمتی جوڑا زیب تن مقشیں کا سہرا، اس پر پھولوں کا سہرا، دست حنائی میں سرد ہے جو داریوں تو یہ برات ہر طرح قابل دید تھی اور لائق تعریف پانچ چھ ہاتھیوں پر جولیاں پری چہرہ جوان نو خاستہ ادائے دلربا کے ساتھ متمکن تھیں اس سے بڑی بہار معلوم ہوتی تھی اور جلے تن عاشق مزاج تماش بین برات بھر میں ان ہاتھیوں ہی کو زیادہ پسند کرتے یوں چہل مذاق کرتے تھے۔ اور عاشقی دم بھرتے تھے۔''۳۵

اس کے علاوہ برات میں نہیں مذاق کی باتیں بھی ہوتی ہیں۔مہاراجہ نے برات میں موجود تماش بین اور رنڈیوں سے اچھے مکالمے ادا کرائے ہیں اقتباس دیکھئے:

''ایک تماش بین نے کہا ہاتھی بیٹھا دو ہم بھی آئیں۔اس کے جواب میں رنڈی نے کہا آؤ آؤ بھائی بہن کے ساتھ بیٹھو۔ وہاں طبلہ کون بجائے گا۔اس پر یارلوگوں نے قہقہے لگائے۔جس نے کہا تھا اللہ کرے ہاتھی کا پاؤں پھسل پڑے۔اس کا جواب یوں شوخ زبان دراز نے دیا اللہ کرے جب ہم ہاتھی سے اتر جائیں تو ہاتھی تجھ پر پھٹ پڑے''۳۶

اس ناول میں مرقع نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔اس سے مہاراجہ کی جزئیات نگاری پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ان کی مرقع نگاری سے اس زمانے کی تہذیب اجاگر ہوتی ہے۔ بارات کا منظر ملاحظہ کیجئے:

''پورے سپاہی ان کے بعد جمعدار پیشہ، عمدہ عمدہ گھوڑوں پر سوار، گھوڑے ہوا سے باتیں کرتے ہوئے زمین پر قدم رکھنا سیکھا ہی نہ تھا۔ کوئی مہدوی پٹھان، کوئی عرب مسالے دار چمکتی ہوئی کلیان سر پر، نانکی

کوئی دہائی زعفرانی، نا ندیڑ کی بنی ہوئی بہت باریک پگڑیاں ران پڑی جمائے ہوئے پشت توسن پر ڈٹے ہوئے ان کے بعد عروب پہلے سوار گھوڑے بادرفتار پھر پیادے، عربی میں گاتے بجاتے ٹمکیاں پیٹتے ناچتے جاتے تھے مگر یہ ناچ بھانڈوں یا کھتکوں کا ناچ نہ تھا۔ مردانہ ناچ تھا۔ سپاہیوں کا ناچ۔ بعد ازاں جوش آئے۔ یہ پیدل یہ بھی گاتے بجاتے تھے۔ سب قوی ہیکل۔ سکھوں کی جماعت تھوڑی تھی مگر دس سِکھ سوسپاہیوں پر بھاری۔ اس کے بعد باجا مغلئی طنبور، بانسری، تاشا، مرفا علاقہ صرفخاص کے ستر ڈنگے انگریزی بینڈ کی کئی برادریاں باجا بجانے والے سب ہوشیار دکن کے رئیسوں کے ہاں کے چوبدار، ہر کالے آرایش کثرت سے تھی اوراچھی بنی تھی۔ آتش بازی جابجا چھوٹتی جاتی تھی۔ ہوائی نشان کے پاس سے چھوٹتی تھی اور چرخ چنبرین کی خبرلاتی تھی۔ روشنی کا خوب انتظام تھا۔ اگر رائی یا خشخاش کا دانہ گرتا تو اندھے تک کوسوجھتا۔ نوشہ کے گلگلوں صبارفتار بادپا کے آگے براتی امرا وروسا عمایدعزیز، اقربا مصاحب اہلکار، یاردوست خراماں خراماں جاتے تھے۔ نوشہ کا گھوڑا خاص الخاص عرب، زرین زردوزی بہاری سامان چاندی کا۔

ترے گھوڑے کی ہیکل کیا بھلی معلوم ہوتی ہے
دولہن پہنے ہوئے چمپا کلی معلوم ہوتی ہے''۳۷ے

مہاراجہ کشن پرشاد نے اس ناول میں مسلم گھرانے کی تہذیب اور شادی کے رسم ورواج کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

شادی کے رسم ورواج:

''دولہا نے برات کے روز بعد مغرب اصلاح بنوائی تھی۔ یہ سبزہ آغاز

تھے۔اصلاح کے بعد جوڑا زیب تن ہوا۔عطر میں ڈوبے ہوئے ان کے ماموں نے سہرا باندھا جس سے اب یہ پورے نوشہ بن گئے۔فرط طرب سے کبھی کبھی آنکھوں سے آنسو نکل جاتے تھے اور یہی بعینہ دلہن کا میکے میں حال تھا۔مگر دوشیزہ اور کم سن ہونے کے سبب سے حیا کا تقاضا تھا کہ دل کو تھامو اور ضبط شادمانی کرو۔بہت مصیبتیں سہنے کے بعد یہ دن اللہ نے دکھایا ہے۔نوشہ مطلوب پایا ہے۔آرزوئے دلی بر آئی۔خدا نے یہ صبح گھڑی دکھائی کہ دلہن بنی۔'' ۳۸

حیدرآباد میں اکثر برات آدھی رات کو روانہ ہوتی تھی۔ برات جب دلہن کے گھر پہنچتی ہے تو بہت سے رسوم انجام دیئے جاتے تھے۔دولہا اور دلہن پر پھول اور چاول پھکوائے جاتے تھے۔اس رسم کو کس طرح سے بیان کیا ہے۔دیکھئے:

''آدھی رات کو یہ برات روانہ ہوئی تھی۔ جب برات داخل منزلِ مقصد ہوئی تو براتی سب علٰحیدہ ہو گئے۔صرف دولہا کے قرابتدار قریبہ رہے۔ دولہا اپنا گھوڑا پھاٹک کے قریب لے گئے۔ یہاں ایک عورت کی گود میں دلہن نکیلی مگر شرمیلی دولہن آئی۔ پھاٹک کے پاس دلہن نے پردے کے اندر سے پھول اور چاول دولہا کے سر تین مرتبہ پھینکے اور پھر اس طرح دولہا کے ہاتھ سے دولہن کے سر پر پھکوائے گئے۔

دولہا کی جانب سے ایک کشتی صندل کی کٹوری میں سوت اور باریک چاول اور کئی کشتیوں میں مصری، خرما، بادام، کشمش، پستہ دولہا پر نثار کرنے کو قاضی صاحب کو پیش کئے گئے۔انھوں نے کشتیاں کھولیں اور کورے کاغذ پر سیاہئی نکاح لکھا۔یعنے دولہا کا نام مع ولدیت وسکونت اور دلہن کا نام مع ولدیت وسکونت وغیرہ وکیلوں اور گواہوں کے نام مع ولدیت اور سکونت لکھے اور مقدار مہر کی تشریح کی فاتحہ خیر کے بعد خطبہ دیا۔

اب ایجاب وقبول کا وقت آیا۔ دولہا نے تو جلد جلد تین بار (قبول کیا میں نے) کہہ کر اتمام حُجّت کیا۔ دولہن بچاری شرم وحیا سے خاموش، بڑے اصرار بلیغ پر دولہن نے بہت آہستہ سے جواب دیا۔ اب دولہا پر سے بادام نثار کیئے گئے اور اہل محفل نے شوق سے لوٹا۔ شربت پلائی ہوئی پہلے دولہن والوں نے کشتیوں میں چھوٹے چھوٹے گلاس رکھے اورنوشہ کے سامنے پیش کیئے اورشربت پی کر دولہا نے ایک اشرفی اس میں رکھ دی۔ ادھر مبارکباد شروع ہوئی مگر دولہا کو ان کُل تکلفات سے خفقان ہوتا تھا۔ اب انواع واقسام کے لذیذ کھانے چنے گئے نوشہ کے ایک چھوٹے سالے نے دونوالے اپنے ہاتھ سے کھلائے۔ ایک میں روپیہ تھا۔ ایک میں ڈلی دیر تک مذاق رہا۔'' ۳۹

جلوہ کی رسم

دولہا کی سالیوں نے دولہا کو دلہن کی جھوٹی مصری کئی بار کھلاتی ہیں اور ہنسی مذاق کرتی رہتی ہیں اقتباس ملاحظہ ہو:

''زینت: دولہا تو معلوم ہوتا ہے کئی دن کا بھوکا ہے۔

پری: اے بہن مسری کھاتے کھاتے کہیں تمہاری ایک آدہ انگلی نہ کترے۔

زینت: معلوم ہوتا ہے گھر میں کھانے کو نہیں ملا۔'' ۴۰

اس طرح جلوہ کی رسم پوری ہونے کے بعد میراثنوں کا جلوہ شروع ہوتا ہے اس کے بعد دلہن کو لے کر اپنے گھر جاتا ہے اس وقت بھی کچھ رسمیں کی جاتی ہیں اقتباس دیکھئے:

''جب میراثنوں کا جلوہ ہو چکا تب سلامی کی کشتیاں اہل برادری کو دے گئیں۔ کشتیوں میں اشرفیاں روپیئے، پاندان کا مسالا تھا۔ دولہا

سب کوسلام کر کے سالیوں سے ہنس بول کر باہر آیا۔عطر پان کے بعد
دولہا کی برات دولہن کے ہاں سے رخصت ہوئی۔ دولہا پشت توسن پر
خوش وشاد، فنس میں دلہن زر اور شک شمشاد عزت گلر خان نوشاد۔ دلہن
جب دولہا کے مکان یعنی اول مرتبہ اپنی سسرال پہنچی تو دونوں کے پاؤں
دودھ اور میوے سے دھلائے گئے اور دونوں کے سہرے ملائے گئے۔''

[۴۱]

اس ناول میں اس زمانے کی مسلم گھرانے کی تہذیب رسم ورواج عقیدے، شادی بیاہ کی تفصیلات کی عکاسی ملتی ہے۔کردار نگاری کے لحاظ سے یہ ناول بڑی اہمیت رکھتا ہے۔اس ناول میں شآد نے بہت سے کردار پیش کئے ہیں اور ہر کردار کی انفرادیت کو پوری طرح نمایاں کرتے ہوئے اس کے احساسات اور نفسیات کی فنکارانہ عکاسی کی ہے۔اس ناول میں رنگیلے شاہ (فتح گر) کا کردار ہے اہمیت رکھتا ہے، انھوں نے سادہ سلیقے سے کہانی بیان کی ہے۔ پڑھتے وقت یہ سارے مناظر ہمارے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔اورانھوں نے اس میں تجسّس کو برقرار رکھا ہے۔کہانی بہت دلچسپ ہے۔زبان وبیان اوراسلوب کے اعتبار سے یہ ناول اہم ہے۔ اگرچہ مہاراجہ نے قصے کے روایتی اسلوب کو اپنایا ہے مگر کہیں کہیں ان کی انفرادیت کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔

حوالے

۱۔	ناول مطلع خورشید، مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ 1897ء،					ص:14
۲۔	ایضاً	"	"	"	"	ص:15,16
۳۔	ایضاً	"	"	"	"	ص:16,17
۴۔	ایضاً	"	"	"	"	ص:19
۵۔	ایضاً	"	"	"	"	ص:21
۶۔	ایضاً	"	"	"	"	ص:28,29
۷۔	ایضاً	"	"	"	"	ص:29-39
۸۔	ایضاً	"	"	"	"	ص:40,41
۹۔	ایضاً	"	"	"	"	ص:46,47
۱۰۔	ایضاً	"	"	"	"	ص:49
۱۱۔	ایضاً	"	"	"	"	ص:53
۱۲۔	ایضاً	"	"	"	"	ص:53,54
۱۳۔	ایضاً	"	"	"	"	ص:61
۱۴۔	ایضاً	"	"	"	"	ص:126-128
۱۵۔	ایضاً	"	"	"	"	ص:150
۱۶۔	ایضاً	"	"	"	"	ص:144,145
۱۷۔	ایضاً	"	"	"	"	ص:156-158

۱۸۔ ایضاً " " " " ص:159

۱۹۔ ایضاً " " " " ص:161

۲۰۔ ایضاً " " " " ص:161,162

۲۱۔ ایضاً " " " " ص:191

۲۲۔ ایضاً " " " " ص:192

۲۳۔ ایضاً " " " " ص:196

۲۴۔ ایضاً " " " " ص:212,213

۲۵۔ ایضاً " " " " ص:225-235

۲۶۔ ایضاً " " " " ص:241

۲۷۔ ایضاً " " " " ص:240

۲۸۔ ایضاً " " " " ص:255-257

۲۹۔ ایضاً " " " " ص:277,278

۳۰۔ ایضاً " " " " ص:284

۳۱۔ ایضاً " " " " ص:289,290

۳۲۔ ایضاً " " " " ص:290,291

۳۳۔ ایضاً " " " " ص:294

۳۴۔ ایضاً " " " " ص:295

۳۵۔ ایضاً " " " " ص:298,299

۳۶۔ ایضاً " " " " ص:300

۳۷۔ ایضاً " " " " ص:299

۳۸۔ ایضاً " " " " ص:302,303

۳۹۔ ایضاً " " " " ص:306-309

۴۰۔ ایضاً " " " " ص:309

۴۱۔ ایضاً " " " " ص:310,311

''چنچل نار''

ناول ''چنچل نار'' مہاراجہ کشن پرشاد شآد کا دوسرا ناول ہے۔ یہ ناول انھوں نے 1903ء میں لکھا۔ یہ ایک رومانی ناول ہے۔اس ناول میں انھوں نے ہندوتہذیب کو اور اسکے عقائد کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔اس ناول کے آخر میں مختلف ادیبوں کے تاریخی قطعات ہیں جس سے ناول کی تاریخ نکلتی ہے۔ یہ ناول مطبع شمس میں طبع ہوا۔ یہ ابتداء میں دبدبہ آصفی میں بالاقساط شائع ہوا کرتا تھا۔اس کے بعد مہاراجہ نے نظر ثانی کر کے اسے چھپوانے کا انتظام کیا۔

اس ناول کے مرکزی کردار پاروتی اور چندرسین ہیں۔ پاروتی اس ناول کی ہیروئن اور چندرسین ہیرو۔ ثانوی کردار لیلاوتی (پاروتی کی والدہ)، پنڈت دین دیال پاروتی کے والد، کہاری (پاروتی کی رازدار)، زبیدہ بیگم، سُندرا اور گن ونتی پاروتی کی سہلیاں ہیں۔ چندرسین کے چچا رتن سین اور متھرا چندرسین کا خاص دوست اور رازدار ہے۔اس کے علاوہ ضمنی کردار بھی ہیں جیسے رام لعل، گوشائیں جی وغیرہ چندرسین پاروتی کو دیکھ کر فدا ہوجاتا ہے اور اس سے عشق کر بیٹھتا ہے۔ان کے عشق کی داستان دسہرہ کے دن گنگا کے کنارہ شروع ہوتی ہے۔اس ناول میں انھوں نے ہندوتہذیب کے رسم ورواج، رہن سہن، بات چیت اور مذہبی عقیدوں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ پاروتی ایک خوش مزاج، شوق چنچل، چھیڑ چھاڑ اور لوگوں کو چکما دینے والی لڑکی ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کی عزت کرتی ہے اور اپنے مذہب کی پابند ہے۔

چنچل نار ایک رومانی ناول ہے۔جس میں مذہب، فلسفہ، محبت وعشق، شادی بیاہ کی اہمیت اور سماجی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چندرسین ایک عقلمند اور ذہین انسان ہے وہ پاروتی کو دل و جان سے محبت کرتا ہے اور اس کو اپنی زندگی کا حصہ بنانا چاہتا ہے۔ یہ ناول حیدرآبادی فضاء اور ماحول میں لکھا گیا جس میں اس دور کے حالات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

اس ناول کوانھوں نے پندرہ عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا عنوان گنگا اشنان، دوسرا، آتشزدگی، تیسرا تازہ گرفتار، چوتھا منگنی، پانچواں باغ کی سیر، چھٹواں نظارہ، ساتواں حسرت بھری نگاہ، آٹھواں بیماری، نواں خط و کتابت، دسواں ملاقات، گیارھواں افشائے راز، بارھواں بدنامی، تیرھواں عنوان پیام حسرت، چودھواں عنوان لطیفۂ غیبی اور پندرھواں عنوان شادی۔

ناول کے عنوانات کی وضاحت خود مہاراجہ نے تفصیل سے کی ہے۔اس ناول میں واقعات مختلف شعبۂ حیات سے اخذ کئے ہیں۔جس میں اتار چڑھاؤ، اقدار کی شکست وریخت، کرداروں کی داخلی کشمکش اور سماجی حالات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

اس ناول کی شروعات شؔاد نے ہندوؤں کا مشہور تہوار دسہرہ سے کی ہے۔ دسہرہ کے دن لیلاوتی، پاروتی، سُندرا اور گن ونتی گنگا میں اشنان کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ مذہبی عقائد کے بارے میں تفصیل اطلاع ہو۔

> ''دسہرہ کے دن گنگا کے کنارے اشنان کے لئے لیلاوتی، پاروتی، سندرا اور گن ونتی جاتے ہیں۔ یہ چاروں نہانے والیاں ایک گھاٹ پر گئیں۔ گنگا میں اشنان کرنا ان کا مذہبی عقیدہ تھا۔ وہ اپنے مذہبی عقیدوں پر عمل کرتے تھے۔گھاٹ والے کا نشان چھتری تھا۔لیلاوتی ہمیشہ اسی گھاٹ پر نہاتی تھی۔ یہاں بھی ہجوم عام زن مرد کا ازدھام ہے۔ان چاروں نے گنگا میں اتر کر دودوغوطے لگائے اوراپنی زعم میں سُرگ کا ایک بڑا کو نا دبالیا۔اور کنارے پرآ کر کپڑے بدلے، ٹیکا لگایا۔ مانگ میں سیندور بھرا، بن ٹھن کرآئینہ میں منہ دیکھا......... اور نیل کنٹھ بھی دیکھا''[1]

میلے، تہوار، عروس بھی تہذیب کے مظاہر ہیں۔ میلے میں ہر قسم کے لوگ موجود رہتے ہیں۔ میلے کا پس منظر دیکھئے:

> ''میلے میں عورتیں مذہبی خیال سے بکثرت تھیں۔ چور، مٹھائی گیرے، اُچکّے، گرہ کٹ بھی اپنے اپنے پیشے کے لیے میلے میں جمع تھے۔کسی کے

ہاتھ سے چوڑی اتر گئی، کسی کے کان کے بالے ندارد، کسی کا جوتا دریا پر سے غائب، کسی کی نظر چوکی اور چھتری چور صاحب کے باپ کی کوئی غل مچاتا ہے وہ رومال لیے بھاگا جاتا ہے۔ کسی کے جیب سے گھڑی نکل گئی۔ ارے بھئی گھڑی تھی ابھی کوئی مار لے گیا۔ دو ایک چور پکڑے بھی گئے۔ مجسٹریٹ کے خیمے کے گرد پولیس والے میلے کے چوروں کو لیے ہوئے موجود۔ کہیں بید پڑ رہے ہیں کسی کو قیدِ سخت، کوئی حوالات میں شوقین رنگین مزاج اور ہی دُھن میں ہیں ان کو سوا پرائی عورتوں کو گھورنے کے کوئی کام ہی نہیں۔ اس بدوضعی سے خدا بچائے۔''[۲]

پاروتی شوقین، چنچل اور خوش مزاج تھی یہ میلے میں مٹھائی والے کو چکما دیتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک نوجوان رنبیر سنگھ اور اپنے استاد کو بھی چکما دیتی ے۔ اس سے پاروتی کا کردار ظاہر ہوتا ہے وہ ایک مہذب یافتہ لڑکی تھی۔ اپنے نفس پر قابو رکھتی ہے۔

اس ناول میں ہنومان کی مندر کا ذکر ملتا ہے جوان عقیدت مند درشن کرنے جاتے ہیں۔ ہنومان جی کے حلیئے کا بیان مہاراجہ نے عمدہ طریقہ سے کیا ہے دیکھئے۔

اس ناول میں ہنومان کی مندر کا ذکر کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''دربار کے کنارے آدھ کوس کے فاصلے پر ایک گڑھی تھی جس کو ہنومان گڑھی کہتے تھے ایک سو ایک زینے تھے۔ اس سے بلندی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ گڑھی ایک پہاڑی پر واقع تھی اونچا سا ٹیلہ۔ وندھیہ چل پہاڑ کا سلسلہ اس پر ہنومان جی کی مورت تھی۔ آدمی نہیں دیو کی صورت تھی۔ راجہ رامچند ر کے سپہ سالار، جنزل ہنومان جی سرے پاؤں تک سُرخا سرخ۔ سیر بہوٹی بنے ہوئے دور سے کوئی دیکھتا تو سمجھتا کہ لال کرتی کا جلیل القدر افسر ہے۔ دم کسی قدر مبالغے کے ساتھ کوس بھر کی۔ شیطان کی آنت کا جواب طول امل کی نانی جان، دَمدار ستارے کی بہن ہاتھ

میں بھاری گزر لیے ہوئے کیوں نہیں وہ تھی کون جگادری بندروں کے
گُر و گھنٹال، حضرت میمون کے دادا پیر، بریگیڈیر جنرل امیر البحر'' [۳۷]

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد معاشرت کی عکاسی میلوں، ٹھیلوں، عید و تہواروں کے مرقع کشی کرتے وقت سادہ اور سلیس زبان کا استعمال کرتے ہیں اور مکالمے بھی عام روزمرہ کی زبان میں لکھتے ہیں۔ لیکن جب وہ قدرتی مناظر کو پیش کرتے ہیں تو وہ زبان کو زیادہ سے زیادہ آراستہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنی انشا پردازی، تخیل آفرینی، نکتہ دانی، رنگین بیانی کے جوہر دکھاتے ہیں جس کی وجہ سے مناظر میں حسن و دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ بالا خانے کا منظر دیکھئے:

''بالا خانے پر کچھ عورتیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ مرد وہاں کوئی نہیں ہے۔ دن ڈھل چلا ہے۔ بارہ پر ایک بجے کا وقت ہے۔ وہ عورتیں کھا پی کر ابھی فارغ ہوئی ہیں۔ ایک عورت بڑی بوڑھی ہے وہ فرش پر لیٹ گئی ہے۔ لیٹتے ہی نیند نے اس کی آنکھیں مدد کر دیں۔ خراٹے کی آواز سن کر نوعمر ہمسن عورتیں آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ ایک نے کہا بہن آج خوشی کا دن ہے کوئی تفریح کا مشغلہ ہونا چاہئے تا کہ دن مزے سے گزرے۔ دوسری بولی تفریح کا مشغلہ اور کیا ہوسکتا ہے سوا اس کہ ہم سب مل کر گائیں اور جی بہالائیں۔ دروازے بند کر دو اور دھیمے سُروں میں گاؤ کہ آواز کمرے کے باہر نہ جانے پائے اور ہاں ایسی چیز تجویز کرو جس میں راجہ رام چندر جی کی فتح روان کی شکست اور سیتا جی کے ملنے کا مضمون ہو۔ آج ہی کے دن تو سنگلد یپ فتح ہوا تھا۔ ایک ان میں پر کالۂ آتش لنکا میں آگ لگانے والے سب سے زیادہ شوخ و بیباک تھی۔ اس نے جل کر کہا کہ تم لوگوں کا عجیب بوڑھا مذاق ہے۔ ہم تو پریم رس پر مرتے ہیں۔ اگر گانا ہے تو ایسی چیز کیوں نہ گاؤ جس میں سوز و گداز ہو۔ یہ کہنے کے ساتھ ہی اس یہ غزل نے شروع کر دیا۔

وَلیٔ کون بجھاوے کر جوا کی آگ   وَلئیٔ کون بجھاوے

موری سیّاں تو لیں بیراگ   وَلئیٔ کون بجھاوے کر جوا کی آگ'' ۵؎

ناول ''چنچل نار'' میں محاورے، کہاوتیں اور ضرب الامثال مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ بوڑھے مُنہ مُہاسے لوگ دیکھیں تماشا۔

۲۔ سانپ سونگھ گیا ہے۔

۳۔ جان نہ پہچان خالہ جی سلام

۴۔ تگنی کا ناچ

۵۔ پانچوں گھی میں۔

۶۔ آفت کا پرکالہ

۷۔ جان کی امان پاؤں

۸۔ چھپنے کے لالے پڑے ہیں

۹۔ رال ٹپک پڑتی ہے۔

۱۰۔ دال میں کالا ضرور ہے۔

۱۱۔ سفا کی میں مشتاق جلادی میں طاق۔

۱۲۔ جینے کے لالے پڑے ہیں۔

ان محاورں کو انہوں نے ناول میں مختلف جگہوں اور مواقع پر استعمال کیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ یہ محاورے ضرب الامثال سے سیاق وسباق سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں اور ان سے جو وہ بات بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی معنویت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور اصل محاورے اور ضرب الامثال سماجی وتہذیبی سیاق میں اپنی پوری معنویت کو اجاگر کرتے ہیں۔

اس ناول میں مہاراجہ نے ہندو تہذیب کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ کردار نگاری کے اعتبار سے ''چنچل نار'' کی حیثیت مسلم ہے۔ اس ناول میں بہت سے کردار پیش کئے ہیں۔ ان کرداروں میں مرد، عورت، بوڑھے، جوان اور مامائیں، گارڈن، کوچمین، خادماو غیرہ۔ چندرسین کا کردار ملاحظہ ہو:

''چندرسین ہونہار چھتری کے پوت نے اپنی قوم سے خلاف طبیعت پائی تھی۔فن سپہ گری تو اس کا آبائی تمغہ تھا۔علاوہ اس فن کے تفصیل علم کا بھی اس کو ذوق تھا۔فارسی میں مہارت اور عربی میں بہت کچھ بصیرت اس کو ہوگئی تھی۔اس کے شوق نے سلسلۂ تعلیم کو اب تک منقطع نہیں ہونے دیا تھا۔ ہاتھ پاؤں سے درست شکل وصورت میں طرحدار، بلا مبالغہ ہزاروں جوانوں میں ایک جوان تھا۔اس کی خلقت میں حیاہ کا مادہ تھا۔وہ سادگی اور بے تکلفی کو عزیز رکھتا تھا۔خوش یقینی سے احباب اس کو ایسے ملے تھے جو علم دوست سلیقہ شعار تھے۔یہ گھر میں زیادہ رہتا اور جب تک رہتا کتب بنی کا مشغلہ رکھتا......جب تک تحصیلِ علم کا شوق مجھے باقی ہے شادی کرنے پر مجھ کو مجبور نہ کیا جائے۔''[۷]

اس ناول میں کردار اپنی واضح پہچان رکھتے ہیں اور واقعات میں تسلسل ہے۔ناول کا انداز بیان سیدھا اور بیانیہ ہے۔ناول کا موضوع بے حد محدود اور عامیانہ ہے۔یہ ایک رومانی ناول ہے۔شادؔ نے اس میں عشق ومحبت کی کہانی کو بیان کیا ہے۔چندرسین پاروتی کو میلا میں دیکھتا ہے اور اس سے محبت کر بیٹھتا ہے۔اور پاروتی کے پیار میں بیمار ہوجاتا ہے۔اس کی بیماری شدید ہوجاتی ہے اس کی وجہ سے چندرسین کے چچا رتن سین اور چاچی بہت پریشان ہوجاتے ہیں۔چندرسین کی بیماری کا راز صرف خاص دوست متھرا کو معلوم ہوتا ہے کہ چندرسین پاروتی کے پیار میں بیمار ہے۔متھرا پاروتی اور چندرسین کو ملانے کی تدبیر سوچتا ہے۔اور پاروتی کی خادمہ کہاری سے پورے حالات معلوم کراتا ہے۔اور چندرسین کی خادمہ مہری ہے۔چندرسین کے گھر اس کے دوست آتے ہیں تو مہری ان کی مہمان نوازی کرتی ہے مہمان نوازی بھی تہذیب کی ایک نشانی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایک مہری اندر سے نکلی، اس کے ہاتھ میں خاصدان تھا۔خاصدان میز پر رکھ کر اس نے کہا''بھیا کا مزاج کل سے اچھا نہیں ہے۔حکیم صاحب اس وقت بھی آئے تھے۔کچھ اختلاجِ قلب کی شکایت معلوم

ہوتی ہے۔انھوں نے آپ سب صاحبوں کوسلام کیا ہےاور یہ کہا ہے کہ
ذرا طبیعت ٹھہرے تو میں خود ملنے آؤنگا۔اس وقت معذور ہوں۔سب
احباب پان کھاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اوراپنی اپنی راہ لی''۸؎

دین دیال جاگیردارانہ تہذیب کے علمبردار ہیں۔اس عہد میں اونچے طبقے میں رعب وداب بہت پایا جاتا تھا۔اونچے طبقے میں بھی عورتوں کا درجہ مرد کے مقابلے میں کم تھا۔عورتیں مرد کے قدموں میں جھکتی تھیں۔اس کہانی میں احسان مندی کے جذبے کے تحت دین دیال اپنی بیوی لیلاوتی سے رام لعل کے قدموں پرسر رکھنے کے لئے کہتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''رام لعل پندت دین دیال کے گھر پہونچتے ہیں اور وہاں پہنچ کر پاروتی
کے ماں باپ (لیلاوتی اور دین دیال) سے کُشل منگل (خیر خیریت)
پوچھ لیتے ہیں۔دین دیال اشارے سے لیلاوتی کو رام لعل کے قدموں
پر سر رکھ نے کیلئے کہتے ہیں۔لیلاوتی رام لعل کے قدموں پر سر رکھ کر کہتی
ہے۔''بھگوان تمہیں آنند رکھے۔تمہاری دیا سے میری بچی کی جان
بچی'' رام لعل لیلاوتی کا سر اٹھا کر رام رام یہ سب نارائن کی کرپا تھی۔
میری کیا حقیقت ہے۔پنڈت جی کہتے ہیں ارے بھائی رام لعل تم نے
مجھ پر بڑا احسان کیا۔اس کا بدلہ تم سے کیا کروں''۹؎

اس ناول کا پلاٹ مربوط ہے۔رام لعل جو راجپوت ہے اپنے بیٹے کے لئے پاروتی کا ہاتھ دین دیال سے مانگتا ہے۔دین دیال ذات کے برہمن ہیں وہ یہ سن کر سوچنے لگتے ہیں مگر رام لعل کا احسان کا بدلہ چکانے کا اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں ہوسکتا یہ سوچ کر دین دیال بات دیتے ہیں۔رام لعل کا بیٹا 12 سال کا ہے اور پاروتی 17 سال کی۔جب لیلاوتی کو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ لڑکا پاروتی سے چھوٹا ہے تو دین دیال سے بحث کرتی ہے۔آخر میں دین دیال رام لعل کے احسان کا بدلہ چکانا چاہتے تھے کیونکہ آگ کے حادثہ سے پاروتی کی جان رام لعل نے ہی بچایا تھا۔

پنڈت دین دیال اور رام لعل کی گفتگو سُنیئے:

''پنڈت جی۔ ارے بھائی رام لعل تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا۔ میں اس کا بدلا تم سے کیا کروں۔ رام لعل بھائی بدلا ودلا کیا معنی۔ دنیا میں ایک دوسرے کے کام آتا ہی ہے۔ پنڈت جی سچ ہے مگر تم نے پاروتی کو کیا بچایا میرے گھرانے بھر کے لیے مسیحائی کی۔ رام لعل ''نارائن جلا نے والا ہے انسان سے ہوتا ہی کیا ہے'' پنڈت جی ''سچ تو کہ ہے اگر میں شریف ہوں تو عمر بھر تمہارا احسان مانوں گا۔ اور تو مجھ سے کیا ہوسکتا ہے جان حاضر ہے تو نذر دیتا ہوں۔ ''رام لعل'' بھیّا جی جان تمہاری تم کو مبارک۔ میں بھی تمہارا ہی ہوں۔ لینا دینا کیا ہے مگر ایک چیز مانگوں تم دو اور تمہارے نزدیک مشکل نہیں۔'' پنڈت جی ''وہ کیا کہا کہہ دوں تو میری اصل میں فرق ''رام لعل'' ہاتھ پر ہاتھ مارو''۔ اس طرح وعدہ لے کر رام لعل پنڈت دین دیال سے اپنے بیٹے کے لئے پاروتی کا ہاتھ مانگتا ہے۔ اور پنڈت دین دیال رام لعل کے احسان میں یہ تو کچھ نہیں یہ سمجھ کر ہاں کہہ دیتے ہیں۔''[۱۰]

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس زمانے میں لوگوں میں وضعداری تھی۔ احسان کا بدلہ احسان یا دوسرے بھلے کاموں سے دیتے تھے۔ اس زمانے میں شرافت کا تصور یہ تھا کہ اگر کوئی کسی کی مدد کرے تو زندگی بھر اس کا احسان مند ہو جاتے تھے۔

چھوٹی چھوٹی کہاوتیں اور مذہبی عقیدے ناولوں کے واقعات میں ایک خاص مقصد کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس ناول میں جزبات کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ اس کے بیانیہ طرز پیش کش طنزیہ فقرے اور دل کی گہرائیوں کو چھونے والے جملے قاری پر دیر تک اپنا اثر چھوڑتے ہیں۔ اِدھر پاروتی اور اس کے دونوں سہلیاں سُندرا اور گن ونتی باغ کی سیر کے لیے نکلتے ہیں۔ شام کے پانچ بجے یہ تینوں گاڑی میں سوار ہو کر روانہ ہوئیں۔ مندر کو جانا بھی ہندو تہذیب کی ایک اہم نشانی ہے۔ ہندو لوگ مندر جا کر اپنے اپنے طریقے سے عبادت کرتے ہیں۔ مندر کے پاس کا پس منظر ملاحظہ ہو:

''گاڑی شام سندر کے باغ کی طرف جارہی ہے جو شہر سے جانب جنوب تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔ اس باغ میں ہنومان کا ایک مندر ہے۔ منگل کے دن یہاں بڑا مجمع ہوتا ہے۔ لوگ پوجا کے لئے اس مندر میں آتے ہیں۔ اور بہت سے مرد اور عورتیں صرف درشن کر کے واپس جاتی ہیں۔ بعض آزاد اور شوقین، صرف عورتوں کو گھورنے اور دل لگی کرنے کی غرض سے آتے ہیں۔ اور اس قسم کے لوگوں کا جماد پھاٹک کے قریب ایک چبوترے پر رہتا ہے۔ جہاں کسی پر ٹیچھم کو دیکھا تو لٹو ہو گئے۔ اگر اس کے ساتھ کوئی مرد نہ ہوا اور سمجھے کہ عورت شوقین ہے تو آواز کسنے لگے۔ جب پاروتی کی گاڑی سامنے سے گزری ایک نوجوان نے با آواز بلند کہا۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں''[11]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں مندر میں لوگ درشن کرنے جاتے تھے۔ وہیں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کا مقصد عورتوں کو گھورنا اور ان پر فقرے کسنا بھی ہوتا تھا۔ کشن پرشاد کے ناولوں میں برجستگی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں شہری، دیہاتی، عالم، جاہل، نواب و مصاحب، حاکم و محکوم، آقا و غلام، وکیل و خوانچہ والا۔ بیگم و ماما سب اپنی اپنی زبان میں گفتگو کرتے ہیں اور بعض اوقات وہ صرف چند جملوں میں ہی ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ پورے عہد اور طبقے کی روح سمٹ کر آ جاتی ہے۔ پاروتی باغ میں ایک نوجوان رنبیر سنگھ کو بھی چکما دیتی ہے۔ اقتباس دیکھئے:

''میں خوشی سے اس کا مطلب پورا کر دوں گی۔ موے کو مجھ ہی پر ٹیچھم ملی ہے کاہیکو ہوگی۔ تم ذرا چپ رہو دیکھتی جاؤ ایسا تگنی کا ناچ نچاؤں کہ عمر بھر یاد کرے''[12]

مکالمہ نگاری کے اعتبار سے یہ ناول کامیاب ہے۔ اس میں جو مکالمے ہیں وہ کہیں کہیں بہت طویل

ہو گئے ہیں لیکن اس کو پڑھنے کے بعد کہیں اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔بعض جگہوں پر مکالمے بالکل مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ معنی خیز بھی ہیں۔کشن پرشاد نے مکالموں کو جس طرح سے ادا کروایا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے تجربات بہت گہرے ہیں۔پڑھے لکھے کرداروں کے ذریعہ ادبی اور عالمانہ مکالمے ادا کرائے گئے ہیں۔جاہل اور عام لوگوں کے مکالمے ان کی طبقاتی حیثیت کے مطابق ہے۔اقتباس دیکھئے۔

''پاروتی: نوجوان سے کیا مرضی ہے۔کچھ تو کہو۔
م آئے کیوں ہو۔ہم سے کیا مطلب ہے۔

نوجوان: کیا کہوں میں تمہارے بے دام غلام ہوں۔مطلب
ظاہر ہے چاہے جلالو یا قتل کرڈالو۔

پاروتی: ہنسکر لوابھی سے پاؤں پھیلائے۔رنگ لائی
گلہری۔

نوجوان: آپ اپنا نام اور پتا تو بتائے۔''[۱۳]

اس طرح کی ہنسی مذاق کی باتیں کرکے باغ کی سیر سے پاروتی اور اس کی سہلیاں واپس لوٹتے ہیں تو راستے میں ایک مکان کے پاس چندرسین پاروتی کو دیکھنے کے لئے چھت کے اوپر رکا تھا پاروتی کی نظر اس پر پڑتی ہے۔نظر پڑھتے ہی چندرسین بے ہوش ہوجاتا ہے۔اور پاروتی کے دل میں چندرسین کے خیالات آتے ہیں آخر وہ کون ہے جو میری نظر سے بے ہوش ہوگیا۔عشق اور رومان کا مناظر اور عشق میں انسان پسندی ان کے سبھی ناولوں میں پائی جاتی ے۔عشق کا یہ رویہ دراصل ان کے ناولوں کو داستانوں سے قریب کردیتا ہے۔یہ ایک رومانی ناول ہے۔عشق کے بارے میں مہاراجہ کا نظریہ دیکھئے:

''حضرت عشق کو تو سبھی جانتے ہیں۔انسان تو انسان فرشتوں کو بھی اس نے کنویں جھکائے ہیں۔کوئی لاکھ نیک پارسا ہو۔ہزار شوخ و چالاک ہو جہاں عشق کا سامنا ہوگیا پھر نہ پارسائی آڑے آتی ہے نہ شوخی و چالاکی کچھ کام دیتی ہے۔اللہ رے شہ زور عشق، رنگ بدل دینا مزاج پلٹ دینا، طبیعت الٹ پلٹ کردینا تیرا ہی کام ہے۔تو نے اب ہماری

پاروتی کی آزادی پر حملہ کرنا چاہا ہے۔خدا ہی خیر کرے

دل پہ آتی ہے وہ آفت کہ قیامت کیا ہے

اس کو ہم سے کوئی پوچھے کہ محبت کیا ہے'' ۱۱۴ اختر

زبان و بیان کے لحاظ سے یہ ناول عمدہ ہے۔ اس ناول میں مہاراجہ نے عمدہ جذبات نگاری کی ہے۔ اِدھر پاروتی بھی چندرسین کے پیار میں بیمار ہو جاتی ہے۔اُدھر چندرسین بھی پاروتی کے پیار میں بیمار، ان کی یہ کیفیت محلّوں والوں کو معلوم ہوتی ہوئی رام لعل کے کانوں تک پہنچتی ہے۔رام لعل دین دیال کے گھر آ کر لیلاوتی سے ظاہر کرتے ہیں تو لیلاوتی غصہ میں آ جاتی ہے اور وہ اسے افواہ سمجھتی ہے۔رام لعل کے جانے کے بعد لیلاوتی پاروتی سے پوچھتی ہے تو وہ صاف انکار کر دیتی ہے۔دوسرے روز یہی بات دین دیال کو معلوم ہوتی ہے وہ گھر آ کر پاروتی کو ڈانٹتے ہیں اور اس کا پہرہ کرا دیتے ہیں۔اور اس کو کسی سے ملنے سے منع کر دیتے ہیں۔

اس میں انھوں نے جگہ جگہ فارسی اشعار کو بھی استعمال کیا ہے۔ چندرسین کی بیماری شدید ہو جاتی ہے۔اس کی بیماری کی حالت دیکھ ایک شعر یوں لکھا ہے:

عدوز دبوسہ بر لعلش دلم دربر تپیدا ینجا

رگِ لیلی زونہ آنجاز مجنون خون چکیدا ینجا

مہاراجہ کشن پرشاد شآد نے اس ناول میں خط کی ٹکنیک کو اپنایا ہے۔اس دور میں خطوط کی بہت اہمیت تھی۔ایک دوسرے کا پیغام خط کے ذریعے پہنچاتے تھے۔متھرا چندرسین کو پاروتی سے ملانے کی ایک تدبیر سوچتا ہے اس کے ساتھ پاروتی کی خادمہ اور راز دار کہاری بھی ساتھ دیتی ہے۔ چندرسین ایک خط لکھ کر کہاری کو دیتا ہے۔اس زمانے میں خط لکھ کر اپنے دل کا حال بتاتے تھے۔خط و کتابت بھی تہذیب کی ایک نشانی سمجھی جاتی ہے۔خطوط کے ذریعہ اپنے دل کا حال خادمہ کے ہاتھ محبوب یا عاشق تک پہنچانا دراصل داستانوی اثرات کی نشاندہی کرتا ہے۔داستانوں میں ایسے ہی خط کے ذریعہ محبوب کو پیغام رسائی جاتی تھی۔ شآد کے ناولوں کو پڑھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان کے ناولوں پر داستانوں کے اثرات کے اسباب کیا ہیں۔دراصل شآد جاگیردارانہ تہذیب کے پروردہ تھے۔ان کے سامنے قصّے، کہانیاں اور داستانوں کی شکل

میں نمونے کے طور پر موجود تھیں۔سرشار کی ناول نگاری کے اثرات بھی ان کے ناولوں پر پائے جاتے ہیں۔ سرشار کے داستانی اسلوب سے شاؔد بہت متاثر تھے۔ان اثرات کی نشاندہی ان کے ناولوں میں آسانی کی جاسکتی ہے۔اسلوب نگاری کے اعتبار سے کشن پرشاد کا یہ ناول ایک اچھا ناول کہلانے کا مستحق ہے۔ان کا اسلوب سادگی سے بھرا ہوا ہے۔زبان پر ان کو عبور حاصل ہے۔اس میں انھوں نے سادہ سلیس، عام فہم زبان کو استعمال کیا ہے۔خط کا اسلوب دیکھئے:

''حیا پرور پاروتی میں نے تمھیں دیکھا اور تمہارا اخلاق سنا ہے حسنِ صورت کے ساتھ حسن سیرت بھی تم رکھتی ہو۔اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ تم مجھ سے ناواقف نہیں ہو۔ان سب باتوں پر نظر کر کے میں یہ کہنے کی جرات کرتا ہوں کہ مجھ پر یکا یک ایسی افتاد آ پڑی ہے جس کا اٹھالینا میری طاقت سے باہر ہے۔دو بار میں نے تم کو دیکھا۔پہلی بار اپنا دل تم پر نثار کر دیا۔دوسری بار ہوش وحواس تصدیق کر دیئے اور یہ دونوں باتیں میری میں اختیاری نہ تھیں۔تمہاری محبت نے مجھے گھیر لیا ہے۔۔۔۔۔ میں کوئی حق نہیں رکھتا کہ اپنے خط کا جواب تم سے چاہوں۔مگر تمہاری مہربانی سے امید ضرور رکھتا ہوں۔سب سے پہلے یہ دیکھنے کی خواہش ہے کہ تمہارا مزاج اب کیسا ہے اور پھر یہ سننے کی آرزو ہے کہ تم نے اپنے بیمار کے لیے کیا دوا تجویز کی۔''[15]

کہاری یہ خط پاروتی کو دیتی ہے وہ پڑھ کر خوش ہو جاتی ہے۔مگر اردو میں جواب دینے میں اسے دقت پیش آتی ہے۔اس لئے وہ اردو سیکھنا چاہتی ہے۔حیدرآباد میں اس دور میں اردو زبان کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔اس دور میں ہندو مسلم بنا فرق مذہب وملت کے تمام لوگ اردو پڑھنا لکھنا سیکھتے تھے۔پاروتی اپنے والد سے پڑھنے لکھنے کا انتظام کے بارے میں کہتی ہے اقتباس ملاحظہ ہو:

''پاروتی پڑھنے لکھنے میں دلچسپی رکھتی ہے اور اپنے باپ سے درخواست کرتی ہے کہ میرے پڑھنے لکھنے کا انتظام کر دیجئے۔میں اپنا وقت کیوں

ضایع کروں۔ چاہتی ہوں کہ اردو میری صاف ہوجائے۔ پنڈت جی کہتے ہیں۔ ''بہت اچھا بیٹا کونسی مشکل بات ہے وہی مُلّا صاحب جس سے تم نے اور زینت بیگم کی صاحبزادی نے بچپن میں پڑھا تھا۔ ان کے بیٹے آدمی لائق اور شریف ادھیڑ عمر کے ہیں ان سے کہہ دوں گا ایک گھنٹہ روز تم کو پڑھا دیا کریں'' دوسرے ہی روز پندت جی نے اس کا بندوبست کردیا''۔ ۱۶

اس طرح پاروتی چند ہی دن میں اردو پڑھنا لکھنا سیکھ لیتی ہے اور چندرسین کو ایک خط لکھ کر کہاری کے ذریعہ بھیجتی ہے۔ کہاری یہ خط چندرسین کو دیتی ہے۔ یہ خط دیکھ کر چندرسین بہت خوش ہوجاتا ہے۔ اور جلدی سے لفافہ کھول کر خط پڑھنے لگتا ہے خط یوں ہے:

''میرے دلنواز تم نے خط لکھا مہربانی کی۔ آدمی کو آدمی سے محبت ہوا کرتی ہے اگر تم کو مجھ سے یا مجھ کو تم سے محبت ہو تو کچھ تعجب نہیں ہے۔ تم نے دوبارہ مجھ کو دیکھا میں ایک ہی بار تمھیں دیکھ کر جھینکتی ہوں کہ کیوں دیکھا . . . . تمہارے خط نے مجھے تڑپادیا، رُلادیا، جلادیا.............. بیماری کا سبب بیان کروں تو کوئی یقین نہ کرے گا۔ کل سے اچھی ہوں تم تردد نہ کرو۔ دردِ دل کی دوا خدا کے ہاتھ ہے اللہ تمھیں اچھا کرے اور اچھا رکھے۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں سوا اس کے کہ مجھ کو تم سے زیادہ مجبوری ہے۔'' ۱۷

چندرسین بڑا جذباتی کردار ہے۔ پورا ناول حیدرآبادی تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ شادی کے لئے دعوت نامے بھیجنے کا رواج اس زمانے میں بھی تھا۔ شادی کے رقعے میں جو زبان استعمال کی جاتی تھی اس سے لگتا ہے کہ کتنے انکساری اور عاجزی کے ساتھ شادی کی دعوت دی جاتی تھی۔ ایک دعوت نامہ دیکھئے:

''دوست متھرا بچے کی شادی درپیش ہے رقعہ تو بعد کو تمھیں پہونچے گا۔ میں ابھی سے کہہ دیتا ہوں کہ پانچ سات روز کے لئے تمھیں شرکت

کرنی پڑے گی۔ یہ سمجھو کہ یہ اپنا ہی کام ہے۔''۱۸؎

کسی بات کو کہنے کے طریقے ہر آدمی کے مختلف ہوتے ہیں۔کوئی چھوٹی سی بات کو تفصیل سے بیان کرتا ہے تو کوئی اسی بات کو سجا سنوار کر تکلفات کے ساتھ بیان کرتا ہے اور کوئی چھوٹی سی بات کو بڑھا چڑھا کر کہنے میں قدرت رکھتا ہے۔مہاراجہ بھی چھوٹی سی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے میں قدرت رکھتے تھے۔

متھرا چندراسین کو یہ خوش خبری دیتا ہے کہ ہم سب شادی میں شرکت کریں تم جلدی سے تیار ہوجاؤ۔ چندرسین منع کردیتا ہے۔ چندرسین ایک تدبیر سوچتا ہے اور اس شادی کے مکان میں تمہاری اور پاروتی کی ملاقات ہوسکتی ہے تو چندرسین جھٹ سے کپڑے بدل کر تیار ہوجاتا ہے۔ چندرسین اور کہاری ان دونوں کی ملاقات کا انتظام ایک مکان میں کراتے ہیں۔مکان کا منظر دیکھئے:

''متھرا کے رہنے کا مکان جس میں چندرسین فروکش ہے جھاڑ فانوس سے سجا ہوا جگمگا رہا ہے دونوں درجے حُسنِ آرائش سے پری بنے ہوئے ہیں۔ ان میں فرش قالین کا ہے جس کے بیل بوٹے چمن کی بہار دکھا رہے ہیں۔اندر کے درجے میں میز بچھی ہے اس پر گلدستے اور پھولوں کے ہار رکھے ہیں۔ میز کے قریب ہی آرام کرسی ہے جس پر چندرسین بیٹھا ہوا ہے۔اس کا رخ صحن کی طرف ہے اور اس کے پہلو میں ایک چھوٹی سی خوبصورت کرسی خالی پڑی ہے۔۔۔۔۔چندرسین پاروتی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ایک بار اس کو ایسی آہٹ معلوم ہوئی جیسے زینے سے کوئی اتر رہا ہو۔اس کا دل سینے میں اچھل پڑا۔اس نے دیکھا کہ زینے تمام کرکے کہاری سامنے آگئی اور اس کے پیچھے ایک برق جہاں تاب بھی کمرے میں داخل ہوئی جس کی تنویر نے جھاڑ فانوس کی روشنی کو ماند کردیا۔وہ برق جہان تاب چندرسین کی جان پاروتی تھی۔ چندرسین پر پاروتی کے حسن کا رعب چھا گیا اور وہ بے اختیار کھڑا ہوگیا۔اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کیا کرے اور کیا کہے۔مگر کہاری کے زبان سے جب

یہ سنا کہ ''سرکار بیٹھ جائیں'' وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پاروتی آنکھیں
جھکائے ٹھٹکی کی ہوئی کھڑی تھی۔ کہاری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کرسی پر
بیٹھا دیا جو آرام کرسی سے ملی ہوئی بچھی تھی اور خود متھرا کے پاس سائبان
میں جا بیٹھی''۔۱۹

دونوں میں آپس میں باتیں ہوتی ہیں اور پاروتی وہاں سے اپنے گھر واپس آتی ہے اور چندر سین کرسی پر گر جاتا ہے۔ چندراسین کو اپنے گھر لایا جاتا ہے وہ پہلے سے بھی زیادہ بیمار ہو گیا تھا۔ متھرا کہاری کو بلواتا ہے اور پوچھتا ہے کہ معاملہ کیا ہے تو کہاری بتاتی ہے کہ پاروتی کی منگنی رام لعل کے لڑکے سے ہونے والی ہے دین دیال رام لعل کو زبان دے چکے ہیں اور وہ زبان کے پکے ہیں۔ یہ بات سنتے ہی چندراسین کے ہوش اڑ جاتے ہیں اور وہ یہ شعر پڑھتا ہے۔

منہ روز حشر بھی نہ دکھا نا رقیب کا
پرورد گار واسطہ اپنے جیب کا

پاروتی اور چندر سین کی عشق کی داستان دونوں گھر والوں کو معلوم ہوتی ہے۔ لیلاوتی اور پنڈت دین دیال پریشان ہو جاتے ہیں۔

کہانی میں موڑ پیدا کرنے کے لئے غیر متوقع واقعات کا سہارا داستانوں میں لیا جاتا تھا۔ خاص طور پر واقعات کو اگر کسی خاص سمت میں موڑ نا ہو تو داستانوں میں کردار کو خواب دکھا کر کسی بات کا جواز فراہم بآسانی کر دیا جاتا تھا۔ اس ناول میں لیلاوتی خواب دیکھتی ہے جس میں دیوی جی اس کی بیٹی کے لئے بر دھونڈنے کی اطلاع دیتی ہیں۔ اس ناول میں داستانوں جیسا مافوق الفطرت عناصر نہیں پائے جاتے ہیں بلکہ مہاراجہ واقعات کو داستانی اثرات کے باوجود حقیقت سے قریب رکھتے ہیں۔ لیلاوتی خواب دیکھتی ہے۔

''میں نے پرسوں رات دیوی ماتا کو (ڈنڈوت) کر کے خواب میں
دیکھا تھا۔ پہلے تو میں سمجھی کہ پڑوس کی کوئی عورت ہے مجھ سے ملنے آئی
ہوگی۔ میں اپنے آسن پر بیٹھی رہی۔ آنگن میں آتے ہی اس نے مجھے
گھُرک کر کہا ''کیوں اے لیلاوتی ہم کو پہچانتی نہیں'' میں ڈر گئی۔

میرے منہ سے نکلا کہ ''مائی میں تم کو نہیں پہچانتی''۔بس دیوی ماتا نے مجھ پر آنکھیں نکال کر کہا ''میں تیرے پتی کی کُل دیوی ہوں: لے تیری بیٹی کے لئے بَر ڈھونڈ لائی ہوں''

یہ کہہ کر اس نے ایک لڑکے کا ہاتھ جو اس کے ساتھ تھا میرے ہاتھ میں دے دیا۔اس کی سندر صورت اور چال ڈھال دیکھ کر میں حیران ہوگئی اور تھا تو وہ لڑکا مگر ایسا کم عمر بھی نہ تھا۔میری نیند ہوشیار ہوگئی۔اور مجھے یقین ہوگیا کہ اب پاروتی کے بیاہ کا وقت آ گیا۔''۲۰

پرانے زمانے کے لوگ زیادہ عقیدت اور توہم پرست تھے۔وہ ہر کام کو قسمت کا کھیل سمجھتے تھے۔جو بھی ہوتا ہے وہ سب خدا کی مرضی سے ہوتا ہے سب کچھ اسی کا چلتا ہے وہ چاہے جس کو جدھر چاہے لے جا سکتا ہے ہم لوگ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔اس عہد کے لوگ تقدیر پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔ہندو تہذیب کے بہت سے رسم و رواج خاص طور پر شادی بیاہ سے متعلق کئی رسموں کا بیان اس ناول میں ملتا ہے۔شادی بیاہ کے وقت ہندوؤں میں ایک اہم رسم یہ ہوتی ہے کہ لڑکی یا لڑکے کی جنم پتری دیکھتے ہیں۔اس کے بعد بات آگے بڑھاتے ہیں اقتباس ملاحظہ ہو:

''پنڈت جی کہتے ہیں بات تو یہ ہے کہ قسمت کے لکھے کو برہما بھی نہیں مٹا سکتے۔دیکھو جنم پتری بھی اچھی طرح سے جڑتی ہے۔تیس گن پورے اترتے ہیں۔دونوں سُکھ سے رہیں گے''۲۱

جنم پتری دیکھنے کا رواج آج بھی ہندو قوم میں رائج ہے۔اس کے علاوہ کسی بات کو طئے کرنے سے پہلے مندر کا چکر لگانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔اس اقتباس میں دیکھئے:

''لیلاوتی کہتی ہے۔چلو ایک روز مہورت دیکھ کر دیوی کے مندر میں پھیر کر ڈالو پنڈت جی کہتے ہیں ''یاں سوچ بچار کا موقع نہیں رہا۔دیوی ماتا نے طے کر دیا اور اس کا خیال نہ کرو کہ خواب میں وہ لڑکا تم کو زیادہ عمر کا دکھائی دیا۔سپنے کا حال ایسا ہی ہوتا ہے ہو نہ ہو رام لعل ہی کا لڑکا ہوگا

اورصورت تو اس کی اچھی بھلی ہے۔ اچھا میں رام لعل کو آج کہہ لا بھیجتا ہوں'' ۲۲؎

یہ سب باتیں صبح میں ہوئی تھیں شام میں پنڈت جی باہر سے یہ صورت بنائے چلے آتے ہیں وہ بالکل حواس یافتہ تھے چلنے میں پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ آنکھیں ڈبڈبائی ہوئیں چہرے کا رنگ اڑا ہوا، بدحواسی میں چوتھی بغل سے نکل پڑی اور ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے ہیں گویا انس ہی نہیں۔ دھوتی کا یہ حال ہوگیا ہے کہ دونوں ہاتھوں سے سنبھالتے ہیں مگر وہ نیچے آ ہی جاتی ہے۔ ہانپتے کانپتے اندر پہنچتے پہنچتے ہی پگیا اتار کر پھینک دی اور چلاّ چلاّ کر رونے لگے اور اول فول بکنے لگے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہائے میں کہیں کا نہ رہا۔ آبرو ڈوب گئی۔ منہ دکھانے کی صورت نہ رہی۔ مجھ کو زہر دے دو۔ میں کھا کر سو رہوں۔ میں مر گیا۔ میں لٹ گیا۔ میں کیا جانتا تھا کہ بڑھاپے میں میرے داغ لگے گا۔ عزت خاک میں مل جائے گی۔ تیرا استیاناس ہو، تو ایسی پاپن نکلی (یہ اشارہ پاروتی کے طرف تھا)۔'' ۲۳؎

اس زمانے میں عزت کا خیال بہت زیادہ رکھا جاتا تھا۔ کچھ بھی ہو جائے مگر عزت کو بچائے رکھنے کے لئے جان بھی لڑا دیتے تھے۔ یہ اس زمانے کی وضعداری کا ایک اہم حصّہ تھا۔ پنڈت جی کے واویلا مچانے کے پیچھے دراصل یہی عزت نفس میں بٹہ لگ جانے کے اندیشے کی بناء پر تھا۔

دین دیال کی یہ باتیں سُن کر لیلاوتی کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ وہ دونوں بہت پریشان ہو جاتے ہیں اور پاروتی پر پہرہ لگا دیتے ہیں کسی سے ملنے اور بات کرنے سے منع کر دیتے ہیں۔ یہ بات چندرسین کے دوست متھرا کو معلوم ہوتی ہے اور اس بات کا پتہ پاروتی کی بچپن کی سہیلی زبیدہ بیگم کو ہوا۔ وہ فوراً ماما کو ساتھ لے کر پاروتی سے ملنے اس کے گھر آتی ہے۔ پاروتی زبیدہ کو دیکھ کر اور لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے۔ زبیدہ اس کے آنسو پوچھتی ہے اور پاروتی کو چندرسین سے ملاقات کرانے کے لئے اپنے گھر لے جاتی ہے۔ اور پاروتی کو دلہن کی طرح سجا کر چندرسین کے پاس بھیجنے کا انتظام کرتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''رات کے نو بجے زبیدہ پاروتی کی تیاری میں مصروف ہوئی اور کہا یہ

فال نیک ہے پاروتی میرا دل گواہی دیتا ہے کہ چندرسین کے ساتھ تیری شادی ہوکر رہے گی ۔زبیدہ نے پاروتی کو سرخ لباس سے آراستہ کیا اور چوٹی کنگھی اپنے ہاتھ سے کر کے مثل دلہن کے اس کو سنوارا۔ گلے میں پھولوں کا گجرا پہنایا۔اور عطر عروس کپڑوں میں ملا۔اس طرح بناؤ چناؤ کر کے اس کو لال پری بنا دیا۔زبیدہ نے اس کی پیشانی چومی اور کہا ''تجھے چندرسین سے ملنا مبارک ہو۔ یہ کہہ کر نقاب سے پاروتی کا چہرہ چھپا دیا۔ پاروتی گاڑی پر سوار ہوئی۔ کہاری سامنے بیٹھی گاڑی اس نقاب پوش عفت کوش کو لے کر روانہ ہوگئی۔''۲۴

جذبات نگاری کی حیثیت سے بھی یہ ناول عمدہ ہے۔شاؔد نے اس میں کئی طرح کے جذبات کو پیش کیا ہے۔ پاروتی اور چندرسین میں کچھ باتیں ہوتی ہیں وہ دونوں اپنے جذبات پر قابو پاتے ہیں۔ پاروتی کو دیکھ کر چندرسین یہ کہتا ہے اقتباس دیکھیے:

''اُف پاروتی! اس وقت تو تم بجلی بنی ہوئی ہو۔تم کو کوئی کسی آنکھ سے دیکھے سرخ جوڑا۔ یہ ٹھاٹھ یہ بناؤ سنگار یہ عطر کی خوشبو، یہ پھولوں کا ہار کیا کہوں کچھ کہہ نہیں سکتا''۲۵

یہ سُن کر پاروتی چندرسین کو یوں جواب دیتی ہے:

''پاروتی: کہہ دو نہ جو دل میں آئے ہے اس کو روکتے کیوں ہو۔ ذہن کند نہ کرو۔ میں خود ہی کیوں نہ کہہ دوں۔ ہاں آج میں دلہن بن کر آئی ہوں اور تمھیں دولہا بنا کر جاؤں گی۔ پاروتی نے اپنے گلے سے ہار اتار کر چندرسین کے گلے میں ڈال دیا۔گویا جئے مالا پہنایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔''۲۶

اس ناول میں حیدرآباد کے اعلیٰ طبقے کے رہن سہن، بات چیت طور طریقے تفصیل سے ملتے ہیں۔

پاروتی وہاں سے اپنے گھر آتی ہے اوراس کی بیماری ٹھیک ہوجاتی ہے۔ لیلاوتی پاروتی کو دیکھ کر خوش ہوجاتی ہے۔ اتنے میں رام لعل آتے ہیں اور لیلاوتی سے کہتے ہیں کہ ''کل رات دس بجے ایک گاڑی میں ایک نقاب پوش اور ہماری کہاری کو دیکھا ہے'' یہ سنتے ہی لیلاوتی کہتی ہے۔''تم کو دھوکا ہوا ہے کوئی اور ہوگی۔ وہ رات گھر سے نکلی ہی نہیں اور پاروتی بیمار پڑی ہے'' مگر پاروتی کی مزاج کو دیکھ کر اسے شبہ ہوتا ہے۔ پاروتی سے پوچھتی ہے تو وہ یوں کہتی ہے:

> ''پاروتی یہ سن کر رام لعل کو کوستی ہے تو اس کی ماں لیلاوتی اسے ڈانٹتی ہے اور بڑوں کو ایسا نہ کہتے وہ تو تیری جان بچائے ہیں ان کا تجھ پر بڑا احسان ہے۔تو بھول گئی۔ پھر پاروتی کہتی ہے''چولھے بھاڑ میں جائے اس کا احسان، آگ سے مجھ کو میرے اللہ نے بچایا وہ کیا بچاتا، چغلور، کلمہنا'' ۲۷

اِدھر چندرسین کی چاچی رتن سین کو ایک تدبیر بتاتی ہے کہ ان دونوں کی شادی جلدی ہوجانی چاہئے۔ رتن سین جواب دیتا ہے وہ برہمن اور ہم راجپوت ان دونوں کا بیاہ ہونا مشکل ہے۔ رتن سین کی بیوی کہتی ہے تم گوشائیں جی سے مل کر آؤ۔ گوشائیں جی کو پنڈت دین دیال بھی مانتے ہیں۔ رتن سین رات میں جاکر گوشائیں جی سے مل کر آتے ہیں۔

فقیر، پیرمرد، بزرگ، گوشائیں لوگ مشترکہ تہذیب کی علامت ہوتے تھے۔ ہندو مسلم سب ان کے پاس جاتے تھے۔ اور سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے تھے۔مل جل کر رہنا بھی مشترکہ تہذیب کا اہم جز ہے۔کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہوتو گوشائیں جی یا فقیر بزرگ لوگوں کے پاس اس حل کے لئے جاتے تھے۔ یہ تفصیلات دیکھئے۔

> ''شہر سے دو میل کے فاصلے پر صحرا میں ایک فقیر رہتے تھے۔ سب ان کو گوشائیں جی کہتے تھے۔ خدا جانے کہاں سے آکر اس جگہ پر رہ پڑے تھے۔ ان کے ساتھ دو خادم تھے۔ وہ بھی فقیر منش اور درویش وضع۔ لوگ کثرت سے گوشائیں جی کے معتقد تھے۔ روشن ان کی ایسی صلح کل تھی

کہ ہندو مسلمان سبھی مانتے تھے۔ مگر ہم نے دیکھا کہ بہ نسبت مسلمانوں
کے ہندوؤں کی آمد و رفت ان کی خدمت میں زیادہ تھی۔ لوگ تو ان کے
کمالات کی نسبت بہت پرلے کی اڑاتے تھے۔ لیکن ہمارا علم جہاں تک
ہے وہ خدا پرست اور متوکل ضرور تھے۔ ان کی بے طمعی نے ایک عالم کو
ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اور بعض بعض موقعوں پر یہ بھی کھُلا کہ گوشائیں
جی علم میں اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ بڑا کمال اسی کو سمجھنا چاہئے اور طرفہ
یہ کہ جس طرح سنتا ستر کے مسائل مع جزئیات ان کی زبان پر تھے اسی
طرح فقہ اسلامیہ کے سوالات کا بھی وہ جواب شافی دیا کرتے تھے جس
سے اہلِ علم کو حیرت ہوتی تھی۔ صاف طور سے یہ کسی پر نہ کھُلا کہ وہ ہندو
ہیں یا مسلمان۔ خیال سب کا یہ تھا کہ گوشائیں جی اگر مسلمان نہیں ہیں تو
موحد ضرور ہیں۔ ان کی باتوں میں بھی توحید کا رنگ زیادہ پایا جاتا تھا۔

کس کی مِلّت میں گنوں آپ کو بتلا اے شیخ
تو کہے گبر مجھے گبر مسلمان مجھ کو

گوشائیں جی کلام مجید کا بھی ورد رکھتے ہیں اور مختلف طریقوں کے فقرا
سے ان کو بیعت بھی تھی۔ چنانچہ بعض بعض مرید جو اہلِ اسلام سے تھے
ان کو ذکر و شغل قادریہ اور چشتیہ کا بتاتے تھے اور انھیں سے یہ بات پایۂ
یقین کو پہنچی کہ گوشائیں جی کو انھیں چاروں خاندان یعنی قادریہ، چشتیہ،
نقش بندیہ اور سہروردیہ سے دستارِ خلافت ملی ہے۔'' ۲۸

مہاراجہ اس ناول میں ہندو تہذیبی زندگی کو پیش کیا ہے۔ گوشائیں جی کی بات رتن سین اور پنڈت
دین دیال مان لیتے ہیں۔ گوشائیں جی پنڈت دین دیال کو اس طرح گیان دیتے ہیں۔ اقتباس دیکھئے:

گوشائیں جی پنڈت دین دیال سے کہتے ہیں، پہلا بچن میرا یہ ہے کہ
دو جیو موت کے منہ میں ہوں اور ان کا بچانا اپنے بس کی بات ہو تو بچانا

چاہئے یانہیں، نارائن کی اگیا کیا ہے''۔ پنڈت جی جواب دیتے ہیں
''کیوں نہیں مہاراج اپنے بُوتے بچانا ہی چاہئے۔ یہی نارائن کی
اگیا ہے۔ گوشائیں تو جب یہ مان لیا کہ دوجیو کو آنند رکھنا نارائن کا
پرسن ہے تو رتن سین کا پتر اور تمہاری کنیا ان دونوں کی کامنا کیوں نہ
پوری کردی جائے۔''۲۹

دوسرے دن صبح رتن سین دین دیال کے گھر جاتے ہیں۔ اکثر لڑکے والے لڑکی کا ہاتھ مانگنے لڑکی کے گھر جاتے ہیں۔ رتن سین بھی اسی مقصد سے جاتے ہیں اور گھر پہنچ کر آواز دیتے ہیں تو پنڈت جی ان کا کس طرح سے سواگت کرتے ہیں ان کا جوش دیکھئے:

''پنڈت جی دروازے پر پہنچ کر پگیا دست کر کے سر پر رکھی۔ دھوتی
کے بیچ کو ایک بار کسا اور گاڑھے کا میلا انگوچھا جو ہاتھ میں تھا اسے آپا
شاہی جوتیوں پر پھٹکار کے کاندھے پر ڈال لیا۔ انگرکھے کے بند
باندھتے ہوئے گاڑی کا طرف بڑھے۔ ایک شخص وضع متوسط العمر
عمدہ لباس پہنے ہوئے چہرے سے ذہانت ومتانت ٹپکتی ہوئی تیوروں
سے بانکپن نمایاں، گاڑی سے اتر کر جلد جلد پنڈت جی کے طرف آیا
اور پالگن کہتے ہوئے ذرا سر کو خم کیا۔ پنڈت جی ہاتھ میں ہاتھ لئے
ہوئے اس کو بیٹھک میں لے آئے۔ جب اطمینان سے دونوں بیٹھ
چکے تو سلسلۂ گفتگو آغاز ہوا اور ابتدا اسی شخص کی طرف سے ہوئی جو
ملنے آیا تھا۔

جناب میں اس وقت گوشائیں جی کا بھیجا ہوا آپ کی خدمت میں
حاضر ہوا ہوں۔ رات انھوں نے مجھے یاد فرمایا تھا یہ ارشاد کیا کہ
پنڈت جی سے ہم سے باتیں ہوگئی ہیں تو صبح سویرے ان کے پاس
جانا۔ پنڈت جی: رتن سین مہاراج تم سچ کہتے ہو، بیشک گوشائیں جی

سے مجھ سے باتیں ہوئی ہیں وہ تو مہا تما ہیں (ہاتھ اٹھا کر) نارائن
ان کو سلامت رکھے'' ۳۰؎

دونوں گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہوتی ہیں۔ اور یہ خبر شہر میں پھیل گئی کہ پاروتی اور چندرسین کی شادی ہو رہی ہے۔ شادی کے بات سن کر دوست و احباب سب خوش ہو جاتے ہیں اور شادی کے رسم و رواج اور شادی کی دھوم دھام ملاحظہ ہو:

''زبیدہ اس بیاہ کی خوش خبری پا کر اچھل پڑی۔ اس نے مانجھے کا جوڑا پاروتی کے واسطے بھیجا اور مبارک باد کہلا بھیجی۔ رتن سین کے گھر میں عید ہو گئی۔ جو جو منتیں مانی گئی تھیں وہ سب اتاری گئیں۔ شکر کے سجدے ادا کئے۔ خوشی کی نوبت بجنے لگے۔ چندرسین کی شگفتگی نہ پوچھئے جیسے سوکھا ہوا درخت پانی پا کر از سرِ نو لہلہانے لگے وہی حال اس کا ہوا۔ وہ دن اللہ نے دکھایا جو وھم و گمان میں نہ تھا۔ خوشی دل میں آئی۔ اور مثل خون کے رگ رگ میں دوڑ گئی۔ ہنسی نے ہونٹوں پر اپنا رنگ جمایا اور چہرے پر شباب کی تازگی بہار دکھانے لگی............... سرور و نشاط کی آمد ہوئی۔ رفتہ رفتہ تمام گھر خوشی سے بھر گیا۔ امیدیں پوری ہو ہو کر چندرسین پر تصدق ہونے لگیں۔ آرزوؤں نے پھُل پھل کر خوشی کا باغ لگا دیا۔ شاہدِ مقصود نے چہرے سے نقاب اٹھا دی۔ مرادیں گلے مل کر عید منانے لگیں۔ مسرت کا جوش ہوا۔

ہاتھ اس نے دل یہ چاہ سے رکھا نہیں ابھی
سینے میں ہاتھ بھر کا کلیجا ابھی سے ہے'' ۳۱؎

اس طرح سب خوشی خوشی سے چندرسین اور پاروتی کو مبارک دیتے ہیں۔ اس ناول کے چند جملے قاری کو حیرت کی دنیا میں لے جاتے ہیں اور ناول اپنے قاری کو حقیقتوں کی گہرائیوں تک لے

جانے میں مدد کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ اس ناول کا قصّہ نیا نہیں ہے۔ بلکہ یہ سرشار کے ناول کامنی کے قصّہ سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ ان دونوں ناولوں میں فرق تہذیبی و سماجی پس منظر کا ہے۔ مہاراجہ کے اس ناول میں حیدرآبادی سماج وتہذیب کی عکاسی بھی ملتی ہے جبکہ کامنی کے پس منظر میں شمالی ہند کی ہندو تہذیب کی جھلک نظر آتی ہے۔

حوالے

۱۔ ناول ''چنچل نار''، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، 1903ء، ص:10

۲۔ ایضاً، " " " " " ص: 11,12

۳۔ ایضاً، " " " " " ص: 15, 16

۴۔ ایضاً، " " " " " ص: 17, 18

۵۔ ایضاً، " " " " " ص: 20, 21

۶۔ ایضاً، " " " " " ص: 21, 22

۷۔ ایضاً، " " " " " ص: 27

۸۔ ایضاً، " " " " " ص: 31,32

۹۔ ایضاً، " " " " " ص: 33

۱۰۔ ایضاً، " " " " " ص: 40,41

۱۱۔ ایضاً، " " " " " ص: 47, 48

۱۲۔ ایضاً، " " " " " ص: 49, 50

۱۳۔ ایضاً، " " " " " ص:45

۱۴۔ ایضاً، " " " " " ص: 44,45

۱۵۔ ایضاً، " " " " " ص:15, 16

۱۶۔ ایضاً، " " " " " ص:122

۱۷۔ ایضاً، " " " " " ص:127,128

۱۸۔ ایضاً، " " " " " ص:133

۱۹۔ ایضاً، " " " " " ص:150.152

۲۰۔ ایضاً، " " " " " ص:160-163

۲۱۔ ایضاً، " " " " " ص:156, 157

۲۲۔ ایضاً، " " " " " ص:26,27

۲۳۔ ایضاً، " " " " " ص:183,184

۲۴۔ ایضاً، " " " " " ص:217

۲۵۔ ایضاً، " " " " " ص:228

۲۶۔ ایضاً، " " " " " ص:224,225

۲۷۔ ایضاً، " " " " " ص:226

۲۸۔ ایضاً، " " " " " ص:234,235,236

۲۹۔ ایضاً، " " " " " ص:235

۳۰۔ ایضاً، " " " " " ص:257

۳۱۔ ایضاً، " " " " " ص:260,261

بزمِ خیال

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد اصلاحی اور معاشرتی ناول لکھنا چاہتے تھے۔ اور وہ رتن ناتھ سرشار کے ناول ''فسانۂ آزاد'' سے بہت متاثر ہوئے اور اسی اسلوب میں ''بزمِ خیال'' ناول لکھا۔ اور اس ناول میں انھوں نے زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ اور اس دور میں نوابوں کے گھر حیدرآبادی تہذیب کے رسم و رواج، لباس، رہن سہن، بات چیت، چال چلن، آداب و اسلام، عیدوں، تہواروں، میلے، جلسے، ادبی محفلیں، مشاعرے، عروس وغیرہ کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے اردگرد کے زندگی کے واقعات کو تہذیبی و سماجی پس منظر کے ساتھ ساتھ مزاحیہ انداز میں بھی پیش کیا ہے۔ اور اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے زیادہ سے زیادہ ماحول کی تصویر کشی کر کے اپنے عہد کی معاشرت کے جیتے جاگتے واقعات کو پیش کر لکھیں۔

ناول ''بزمِ خیال'' تین جلدوں میں ہے۔ کل 958 صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد 288 صفحات پر دوسری جلد 367 صفحات پر اور تیسری جلد 303 صفحات پر مبنی ہے۔ اس میں مختلف ابواب ہیں جن کے الگ الگ عنوانات ہیں۔ انھوں نے اس ناول کو مختلف حصّوں میں اس طرح تقسیم کیا ہے جلد اوّل میں نواب کے گھر لکچر، صبح بہار، امید کی بہار، عالم تصور، شطرنج، تاڑ بن کا میلہ، ایک سیاح سے ملاقات اور ظریف الدولہ کی مٹر گشتی۔ دوسری جلد میں نواب کے گھر قومی مجلس، چاند کی سیر، تہیۂ سفر، عیش کی رات، ظریف الدولہ اور قلندر شاہ کی سیر خانہ جنگی، نشے کی ترنگ، خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا تھا افسانہ تھا، نواب کی واپسی، چڑھا وے کا پیغام، کلب میں گپ شپ، ہائے کس نے جگا دیا مجھ کو، خوش گپیاں، نصیر اور شاطر کی گفتگو، سپھر آرا اور مغلانی کی گفتگو، پچھلی رات، جلسہ، پنڈت کی دُرگت اور جلد سوم میں میاں بیوی کی باتیں، پولو اور فتح میدان لالہ کے گھر دعوت، برج کی دعوت، اَلا انتظار اَشدُّ مِنَ المَوت۔ سپھر آرا بیگم کے گھر خواتین، رفیق کے گھر

دعوت، سمدھیوں میں خط وکتابت، شادی خانہ آبادی، رخصت عروس، کامیابی اوراس کی خوشی، چوتھی۔

اس ناول کا قصّہ مختصر ہے لیکن نواب اور ظریف الدولہ کی وجہ سے طویل اور وسیع ہو جاتا ہے۔ اس ناول میں مہاراجہ کشن پرشاد شآؔد نے حیدرآباد کی تہذیب ومعاشرت رجحانات ومیلانات اور متعدد واقعات کو پیش کیا ہے۔

کشن پرشاد شآؔد کے ناولوں کے مکالموں میں برجستگی اور بے ساختگی پیدا ہوجاتی ہے اور وہ فطری معلوم ہوتے ہیں۔ شآؔد کے یہاں شہری اور دیہاتی، عالم اور جاہل، نواب ومصاحب، حاکم ومحکوم، آقا وغلام، وکیل وخوانچہ والا، بیگم و ماما سب اپنی اپنی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ اور بعض اوقات وہ صرف چند جملوں میں ہی ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ عہد اور طبقے کی روح سمیٹ کر آجاتی ہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد شآؔد ناول ''بزمِ خیال'' میں سماج کے مختلف پہلو اور رنگوں کو مختلف انداز سے مختلف طبقوں کے کردار کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ اور اس میں انھوں نے کچھ حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ ان کے ناول کا ہر کردار اپنے اپنے طبقے کی پوری پوری نمائندگی کرتا ہے۔ کشن پرشاد شآؔد اپنی مکالمہ نگاری سے کردار میں جان ڈال دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناول میں اس عہد کا حیدرآباد کی معاشرتی زندگی کی تصویر کھینچی ہے۔ انھوں نے کرداروں کے اخلاق وتہذیب اور رہن سہن، لباس کے بارے میں لکھتے ہیں اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ابھی اس برہمن نجومی نے بات ختم نہیں کی تھی کہ ایک فقیر دبنگا خم وچم سے پہلوان معلوم ہوتا تھا لابنی لابنی اور کالی کالی زلفیں، سِن تقریباً پچاس کا گلیم بردوش، نعلین چوبی پاؤں میں کاہو کے رنگ کا عمامہ سر پر اور کجکول در بر کھٹ کھٹ کرتا ہوا آیا۔''[1]

ان کے لباس، رہن سہن سے بات چیت، چال چلن سے حیدرآباد کی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہر قوم اور ہر ملک کی اور ہر مذہب کی الگ الگ تہذیب ہوتی ہے۔ اس ناول میں انھوں نے مسلم گھرانوں اور نوابوں کی تہذیب، شادی بیاہ، رسم ورواج، جشن سالگرہ وغیرہ تقاریب کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد شآؔد کا اسلوب سیدھا سادہ ہے۔ انھوں نے اس ناول میں مختلف زبانوں کو استعمال کیا ہے۔ جیسے اردو،

فارسی، عربی اور انگریزی اس کے علاوہ اردو، عربی و فارسی کے اشعار جگہ جگہ پر استعمال کئے ہیں۔

اس دور میں ہر مذہب میں تو ہم پرست لوگ موجود تھے۔ بڑی بیگم تو ہم پرستی میں محو رہتی تھیں۔ صرف بڑی بیگم ہی نہیں اس دور کے بزرگ زیادہ تو ہم پرست واقع ہوئے تھے۔اس بارے میں مہاراجہ کشن پرشاد شآد لکھتے ہیں اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہاں کی ضعیف الاعتقادی تو مشہور ہے۔جس کسی کو گیروے لباس میں دیکھا یا کسی کی ڈاڑھی لانبی اور وضع مشائخ کی سی پائی یا کوئی جٹپن بڑھائے ہوئے اور بھبوت رمائے ہوئے نظر آیا۔بس سمجھ گئے کہ خدا اسی بھیس میں ہے پھر کیا ہے جہاں کہیں ان میں سے کوئی محفل کی شمع بنا سارے حاضرین پروانوں کی طرح قربان ہونے لگے۔'' ۲

اس ناول میں سب سے نمایاں شخصیت نواب کی ہے جو جدید و قدیم کی آمیزش اور جزباتی و فکری کشمکش کی بدولت ظہور میں آتا ہے۔نواب کے کردار کے ذریعہ حیدرآبادی ادبی محفلوں، جلسوں، سیر و تفریح، آداب و اسلام، عادات و اطوار کو پیش کیا ہے جس سے نوابی گھروں کی معاشرے کا پتہ چلتا ہے۔اس کے علاوہ نواب کے دوست رفیق قلندر ہیں جو تو ہم پرست ہیں۔اور مذہبی اقدار سے عقیدت مندی حد سے زیادہ تھی۔

''یہ ایک فقیر منش شاعر بے بدل ہیں۔نور محل کی پیدائش شریف خاندان سید النسب غوث علیشاہؒ کے دیکھنے والے اور انھیں کا نام رکھا ہوا ہے ''قلندر'' اور اسی تخلص سے مشہور ہیں۔ مذہب ان کا سنت جماعت ہے لیکن پکے صوفی صلح کل ان کا مشرب ہے۔مرنجان مرنج دوست دشمن کو ایک ترازو میں تولتے ہیں۔کفر و اسلام کو ایک ہی نور کا ظہور سمجھتے ہیں۔''

۳

مہاراجہ کشن پرشاد شآد اپنے کرداروں کو پیش کرنے کے لئے ڈرامائی طریقہ سے کام لیا ہے وہ کسی تعارف و تمہید کے بغیر ڈرامائی انداز میں کرداروں کو پیش کرتے ہیں اور وہ اپنے کردار اپنے عادات و اطوار اور

گفتگو سے پہچانے جاتے ہیں۔مہمان نوازی بھی حیدرآبادی تہذیب میں اہم سمجھی جاتی ہے۔کوئی دوست احباب رشتے دار اپنے گھر آتے تھے تو ان کی بہت عزت کرتے تھے۔اوران کی خاطرداری بھی کرنے لگتے تھے۔ پنڈت جی اپنے رشتہ داروں کی خاطرداری اس طرح کرتے ہیں۔اس بارے میں مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد لکھتے ہیں:

''پنڈت: میرے سسرال کے لوگ آ گئے تھے۔ ان کے واسطے اچھی مغزیات اور دودھ اپوٹ اور مصری بہت سی ڈال کر تیار کی تھی۔ کچھ خرچ ہوئی باقی ساتھ لیتا آیا ہوں سب کے سب۔ واہ بھئی واہ پنڈت ہاتھ کاٹ کے کڑا پہنا نا چاہیے۔

ڈاکٹر: اگر مجھے حکم ہوتو میں آپریشن کردوں۔

نواب: حکمِ صاحب۔آپ کو بمصداق بلّی کے خواب میں چھیچھڑے، آپریشن اور دوا درمن ہی کی سوجھتی ہے۔''۴۴

محاوروں، کہاوتوں اورضرب الامثال کی دنیا بھی بہت عجیب ہوتی ہے۔الفاظ کچھ ہوتے ہیں ان کے لغوی معنی کچھ اور ہوتے ہیں۔ لیکن محل استعمال سے ان کے مفاہیم یکسر بدل جاتے ہیں۔ اردو میں جہاں مختلف زبانوں کے الفاظ دخیل ہوئے وہیں کہاوتیں۔محاورے اورتلمیحات بھی کثرت سے داخل ہوئیں۔ان سے اردو زبان کا دامن وسیع ہوا۔اردوادب میں محاورے اورکہاوتیں اورضرب الامثال زیادہ تر داستانوں اورمثنویوں اور ناولوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اردوادب میں بے شمار مرکب محاورے، اور ضرب الامثال ہیں جو اپنے اصل معنی سے ہٹ کر مختلف مفاہیم میں رائج ہو گئے ہیں۔ان کا وجود ہر زبان کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ یہ الفاظ کے ذخیرے میں قابل قدر اضافہ کرتے ہیں اوراس کی وسعت کا وسیلہ بنتے ہیں۔اسی لیے ہر زمانے، ہر خطے اور ہر زبان میں ان کی اہمیت اور افادیت کومحسوس اوران کی معنویت کوتسلیم کیا گیا ہے۔ یہ زبان کے حسن کو دوبالا کر کے اس کی ادبی اورلسانی شان کونئی بلندیوں سے آشنا کرتے ہیں۔ اردو زبان کا لسانی دامن ہر قسم کی کہاوتوں اورضرب الامثال سے مالا مال ہے۔ ان کے ناولوں میں مختلف موقعوں پر کہاوتیں یہ ہیں:

ناول ''بزمِ خیال'' میں محاورے، کہاوتیں اور ضرب الامثال:

۱۔ آؤ سو جھے نہ تاؤ۔

۲۔ اپنی ہائی اور پرَ گنوائی۔(مثل)

۳۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کا۔

۴۔ (د) کی دال گلتی ہی نہیں۔

۵۔مینڈ کی راز کام پیدا شد(فارسی محاورہ)

۶۔ آسا جیسے، نرا سا مرے(مثل)

۷۔ جس کے دیکھے نہ مرے(مثل)

۸۔ مالے کہ نکوست از بہارش پیدا است(فارسی مثل)

۹۔ لوٹن کبوتر بن گئے۔

۱۰۔ طویلے کی بلا بندر کے سر۔

۱۱۔ لو مینڈ کی کو بھی زکام ہوا کیا خوب۔

۱۲۔ رنگ لائی گلہری۔

۱۳۔ ساٹھے سو پاٹھی مشہور ہے۔

۱۴۔ نگنی کا ناچ نچانا۔

۱۵۔ سانچ کو آنچ نہیں کہتے

۱۶۔ گدھے کو زعفران ک کیا قدر۔

۱۷۔ کسی کی چمڑی جائے دھڑی نہ جائے۔

۱۸۔ دال میں کالا

۱۹۔ پھاگ کے پھگوے اور ہولی کے بھڑوے

۲۰۔ سپنک کی سپنک بگڑ گئی۔

۲۱۔ تیری دُم میں موٹا سا رسّا

۲۲۔ آم کھانے سے غرض پیڑ گننّے سے کیا کام۔

۲۳۔ راجا صاحب کے گھر موتیں کا کال

۲۴۔ گھوڑے بیچ کر سونا۔

۲۵۔ پانی آنے سے پہلے باندھ باندھنا۔

۲۶۔ مردتو ساٹھا پاٹھا مشہور ہے۔

اس دور میں حیدرآباد میں سالگرہ کی تقریب نوابوں کے گھر بہت جوش وجشن سے منائی جاتی ہے۔ نواب صاحب کے گھر دوجشن ایک ہی دن آتے ہیں نواب صاحب کی پھوپھی زبیدہ بیگم نواب صاحب کو دو دومبارک باددیتی ہیں اوردعائیں دیتی ہیں۔مبارک باد دینااور دعائیں دینا یہ بھی تہذیب کی ایک خصوصیت ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''بڑی بیگم: آج منجھلے کی سالگرہ کی تقریب اور یہ اس کے بھائی کی پیدائش کی خوشی دہری مسرت ہے۔ جم جم خدا تجھے ایسی خوشیاں دکھائے۔دلہن دودوں نہائے پُوتوں پھلے۔

نواب: پھوپھی اماں۔ یہ سب آپ کی دعا کی برکت ہے۔آپ کی ان مہربانیوں کو میں ہرگز نہیں بھول سکتا۔ جوآپ میری والدہ کے انتقال کے بعد سے میرے حال پر مبذول فرماتی ہیں۔اگر وہ زندہ ہوتیں تو اس سے زیادہ کیا کرتیں جوآپ نے میرے ساتھ شفقت مادری کے فرض کوادا کیا۔''۵

بڑوں کی عزت کرنا۔ادب واحترام کرنا تہذیب کی نشانی ہے۔اپنے ماں باپ کی عزت کرنا، بڑے بزرگوں کی دیکھ بھال کرناایک اہم فرض سمجھا جاتا ہے یہ بھی تہذیب میں شامل ہے۔

مہاراجہ کشن رشادشآد نے اس ناول میں معاشرتی وتہذیبی ماحول کواچھے انداز میں پیش کیا ہے اور سیرت نگاری سے اس عہد کے معاشرے کی عکاسی بھی کی ہے۔اس ناول کے ہیرونواب کی سیرت تہذیب سے جڑی ہوئی ہے۔نواب تعلیم یافتہ اورمہذب ہیں۔وہ اپنے گھر میں ادبی جلسے،مشاعرے بھی منعقد کراتے

رہتے ہیں۔نواب کے اخلاق وکردار کے بارے میں کشن پرشاد شاؔد لکھتے ہیں:

''نواب باہر آمد ہوئے۔حاضرین نے مبارک سلامت کے بعد نذریں پیش کیں۔ خانساماں نے عرض کیا کہ خداوند نعمت قوال مبارکباد عرض کرنے کے لیے حاضر ہیں اور نوبتی وغیرہ حکم کے منتظر ہیں کہ شادیانے بجائے۔نواب نے قوالوں کی حاضری کا حکم دیا۔اور شادیانے بجانے کی درخواست منظور فرمائی۔نواب نے سب کو درجہ بدرجہ انعام تقسیم کر کے کہا کہ باغِ عام میں آج جاگیرداروں کی کمیٹی ہے۔ہمارا شریک ہونا ضروری ہے گاڑی حاضر رکھو''[۶]

باغِ عامہ میں نواب اور ان کے دوستوں کے درمیان گفتگو ہوتی ہے وہ حیدرآباد کے بارے میں بات کرتے ہیں۔حیدرآبادی سیر وتفریح کے بہت شوقین تھے اور ہیں۔ یہ سیر وتفریح کے لئے باغِ عامہ، تالابوں کی سیر وغیرہ کو تفریح کرنے جاتے ہیں۔اور وہ موسیٰ ندی کی طغیانی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ جس سے اس عہد کے حالات کا اندازہ ہوتا ہے اقتباس دیکھئے۔

''اس ملک حیدرآباد دکن کو جو عروس ابلا دکہلایا جاتا تھا۔جس کے حسنِ دلفریب کے اہل وطن ہی نہیں بلکہ غریب الوطن بھی والہ وشیفتہ اور دلدادہ رہتے تھے۔آج کے روز ایسے آباد پُر بہار شہر کی اکثر آبادیاں رودِ موسیٰ کی طغیانی کی بدولت ویران ہوگئیں۔ وسیع کھلے میدان میں کھڑے ہوکر جس طرف نظر دوڑاؤ نگاہ کا منظر جس قدر وسیع ہوتا جاتا ہے سوا کھنڈروں کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔۔۔۔۔سب دریا برد ہوگئیں۔۔۔کہاں کہاں کے مسافران غریب الوطن اپنے خویش ویگانہ اور وطن سے جُدا ہوکر حیدرآباد فرخندہ بنیاد کو اپنا مامن وملجا قرار دے کر اس کی سرزمین پر آکر زندگی بسر کرتے تھے آج کے روز ان کے نشان بھی بے نشان ہوگئے ہیں۔دنیا کے بھی عجیب عبرت انگیز واقعات ہیں

جو کسی نظر فریب کی خیالی تصویر کی طرح رات اور دن ہماری آنکھوں کے
نظارے بن بن کر مٹتے جاتے ہیں۔'' ۷؎

موسیٰ ندی کے طغیانی میں بہت سے لوگ مارے گئے ۔قدرتی سانحہ کا اس دور کے ہر ادیب اور فکشن نگار کے تخلیق میں اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔اس سانحہ کے اثر کا ذکر کرتے ہوئے مہاراجہ لکھتے ہیں:

''تقریباً 19 ہزار گھر نذرِ آب ہو گئے اور تخمیناً چار ہزار جانیں جزو مدر طوفان میں پھنس کر نھنگِ اجل کا لقمہ ہو گئیں۔شوہر بیبیوں اور بیبیاں شوہروں، باپ بیٹیوں اور بیٹے باپوں اور مائیں بچوں اور بچے ماؤں کو ڈوبتے دیکھا کیے۔۔۔بعض بعض ایسے بھی بدنصیب قسمت کے مارے فلک کے ستائے ملیں گے جن کے کنبے کے بیس بیس پچیس پچیس آدمی چشم وذن میں نذر اجل ہو گئے۔لیکن سخت جانی کے قربان جایئے کہ بے خانماں ہو کر بھی بحالِ تباہ زندہ در گور ہیں۔مرنا چاہتے ہیں مگر موت آتی نہیں۔ارادہ ہوتا ہے کہ کسی حیلے سے اپنے آپ کو اس دکھ کے غم خانے سے نجات دیں۔اور اپنی روح کو اس صدمے کے قید خانے سے آزادی کا پروانہ لا دیں۔مگر کوئی شے اس ارادے کی ایسی حائل ہوتی ہے جیسے سدّ سکندری۔'' ۸؎

میاں نصیر جو نواب کے بڑے فرزند ہیں۔نواب صاحب نصیر تعلیمکے لئے ولایت بھیجتے ہیں۔نصیر تعلیم حاصل کر کے ولایت سے واپس آتا ہے۔میاں نصیر جگت نانا کو اپنا رہبر و رہنما سمجھتے ہیں اور جگت نانا بھی نصیر کو عزیز رکھتے ہیں۔نصیر نہایت مہذب کردار ہے۔انگریزی تعلیم و تہذیب کے اثر سے اس عہد میں زندگی کے ہر شعبے میں یتر ال سے پھیل رہے تھے۔انگریزی تعلیم کے اثرات سے جو تبدیلی معاشرت اور سوچ و فکر میں سدا ہو رہی تھی اس کی طرف بھی اس ناول میں اشارہ ملتا ہے۔حیدرآباد میں مشرقی تعلیم کا ساتھ انگریزی تعلیم کی طرف رجحان عام ہو رہا تھا۔اعلیٰ انگریزی تعلیم کے لئے لوگ ولایت جاتے تھے اس کا تذکرہ یوں ہے:

''میاں نصیر چاشت سے فارغ ہوکر قلیان کا دم لگا رہے تھے کہ خانساماں نے حاضر ہوکر عرض کیا جگت نانا حاضر ہیں۔

نصیر: خانساماں نے سیدھے ان کو بالا خانے پر لے جاؤ میں بھی آتا ہوں۔خانساماں نے بڈھے نانا کو بالا خانے پر لے جا کر بٹھلایا۔

میاں نصیر: تھوڑے عرصہ میں حقہ کے دم لگا کر بالا خانے کے مطلع پر آفتابِ نصف النہار کی طرح جلوہ افروز ہوئے۔''۹

پیر مرد: (میاں نصیر سے) میاں تمہارا بھلا کرے۔چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہوجائے۔نورِ نظر کو جلد گود وں کھلاؤں اور میں اسی طرح تر نوالے اڑاؤں اور منہ مانگی مراد پاؤں اور جوڑے لوں۔جلسے دیکھوں۔''

حُقّہ پینا بھی مسلم تہذیب کا ایک اہم حصّہ ہے۔

سپہر آرا جو اس ناول کی ہیروئن ہے۔اس کا کردار اپنے معاشرے اور ماحول کی سچّی تصویر ہے۔یہ ایک تعلیم یافتہ اور اچھے اخلاق رکھنے والی لڑکی ہے۔یہ مہذب ہے اور اپنی مشرقی تہذیب پر قائم رہتی ہے۔ سپہر آرا کی خادمہ مغلانی ہے جو سپہر آرا کو میاں نصیر کی خط کا ذریعہ بنتی ہے۔اس دور میں مغلانیاں اور مامائیں بہت سے کام انجام دیتے تھے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''مغلانی: اللہ نہ کرے اگر ان کو معلوم ہوجائے کہ ان بیاہی لڑکی نے ایسی سنی سنائی خبر پر اس قدر اپنا حال برا کرلیا ہے تو خدا جانے کیا کر بیٹھیں۔

نصیر: یہ تو کہو تم کو بھیجا کس نے۔اور پھر تم کیوں کر آئیں۔

مغلانی: کیا عرض کروں سر ہتیلی پر رکھ کر آئی ہوں۔صاحبزادی نے مجھے بھیجا ہے۔ان کی والدہ کو بھی خبر نہیں۔ایک دن کی رخصت لے کر آئی ہوں۔''۱۰

اس کے علاوہ اِدھر نواب اور رفیق اور دوست احباب میں گفتگو ہوتی رہتی ہے۔وہ مغربی طرز معاشرت اور مشرقی طرز معاشرت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔اقتباس دیکھیئے:

''نواب، استاد سچ پوچھو تو عورتیں بے شک زیادہ عزت اور رعایت کی مستحق ہیں۔ ہماری قوم سے یہ طریقہ جو اٹھ گیا تو اچھا نہیں ہوا۔''[۱۱]

اس ناول میں سب سے نمایاں شخصیت نواب کی ہے جو جدید وقدیم کی آمیزش اور جذباتی وفکری کشمکش کی بدولت ظہور میں آتی ہے۔نواب کے کردار کے زریعہ کشن پرشاد شاؔد نے حیدرآبادی ادبی محفلوں، جلسوں، آداب کو بیان کیا ہے۔اقتباس دیکھیے۔

''نواب ذیشان نے نطیب خاطر سلام کا جواب حسبِ مراتب ادا فرمایا۔ اور ہر ایک کی مزاج پُرسی کر کے شمع بزم کی طرح میر محفل ہو کر مسند پر جلوہ افروز ہوئے۔ اس محفل میں دو چار نامی شعرا بھی ہیں (۱) ظہؔیر دہلوی (۲) رسؔا۔ رسؔا نے محفل میں سیدھی جانب جگہ پائی ہے۔ایک ذوق مرحوم کی یادگار اور استاد داغ کے ہم عصر دوسرے استاد داؔغ کے خوشہ چینوں سے یہ دونوں باغِ سخن کے گل لالہ ہیں جو اپنی خوشبو سے حاضرین کے داغ کو معطر کریں گے۔''[۱۲]

مغلانی سپھر آرا کا پیغام لے کر میاں نصیر کے گھر جاتی ہے تو میاں نصیر اپنے خانساماں کے ذریعہ اسے اندر کمرے میں لے آنے کو کہتے ہیں۔ مغلانی نصیر کے کمرے میں آتی ہے اور دونوں کے درمیان گفتگو ہوتی ہے۔اس سے اس دور کی معاشرت پر روشنی پڑتی ہے۔اقتباس انھیں کے زبان میں سنیے۔

''مغلانی: کیا عرض کروں بے دیکھے خدا جانے کیوں کر محبت ہوگئی۔ جب دیکھو آپ ہی کا ذکر اور ہر وقت یہی کہتی تھیں کہ میرے چاند کو یہ چاند کا ٹکڑا مل جائے تو بس میں منہ مانگی مراد پاؤں۔

نصیر: مجھے تو کبھی دیکھا ہی نہیں۔ پھر انھیں کیا معلوم کہ میں کالا حبشی ہوں یا گورا چٹّا۔

مغلانی: دردانہ بیگم کے ہاں آپ کی تصویر انھوں نے دیکھی تھی اسی دن سے بس اس کا خیال تھا کہ صاحبزادی کے ساتھ آپ کی نسبت ہو جائے

سچ ہے کہ خدا سے جو مانگو دیتا ہے (بلائیں لے کر) قربان اس کی خدائی

کے خدائی کے آخر جو دل نے چاہا وہی ہوا۔

نصیر: بیشک خدا کے فضل کا معاملہ ہی ایسا ہے۔''۱۳

کشن پرشاد شاؔد سنجیدہ، حُزنیہ اور مزاحیہ تینوں طرح کے کردار اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے مزاحیہ انداز میں ظریف الدولہ کا کردار لطف اندوز طریقہ سے بیان کیا ہے۔ اس ناول میں مزاحیہ کردار ہی ناول کا مرکزی و محور ہوتا ہے۔ سرشار کی طرح کشن پرشاد شاؔد بھی اپنے عہد اور فن کی مناسب سے مزاحیہ کردار پیش کرنے میں زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ پیر مرد ظریف الدولہ کا کردار ملاحظہ ہو:

''پیر مرد ادھر سے اِلّا اللہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر دھم سے گرے اور گرے بھی تو اس بچارے پر لوگوں نے کہا سنبھالنا سنبھالنا۔ مگر یہاں ایسے زیر زبر ہو گئے کہ کسی کی پیش نہ گئی۔ پیر مرد زبر رہے اور اس بچارے ضعیف نے بہت سی کروٹیں بدلیں کہ زیر سے زبر ہو جائے مگر تھا وہ ان سے بھی زیادہ بڈھا صرف ہڈیوں کی مالا۔ اس کا ڈھانچہ بلا مبالغہ طنبورہ تھا۔ پھر کیا پوچھنا ہے اس چھیڑ چھاڑ سے جو پردے پردے میں ہوئی اس بچارے کی بُری گت بن گئی۔''۱۴

میلے جاترے عروس حیدرآبادی مجلسی زندگی کے اہم اجزاء سمجھے جاتے ہیں۔ پیر مرد، نصیر اور قلندر تاڑبن کا میلا دیکھنے جاتے ہیں۔ تاڑبن کے میلے کے بارے میں مہاراجہ لکھتے ہیں جس سے ان کی جذیات نگاری پر عہد کا اندازہ ہوتا ہے۔

''سال گزشتہ جو رونق میلے میں تھی اب کے اس کے آدھی بھی نہیں لیکن تب بھی سواریاں ہیں کہ چلی آتی ہیں۔ غٹ کے غٹ ٹھٹ کے ٹھٹ، بالکے شہدے۔ گرہ کٹ، اٹھائی گیرے، چرسیے، مدکیے، گنجیر یے، بھینگڑے، شریف و نجیب امڈے چلے آرہے ہیں۔ تامدان ہودار فنس۔ بوچہ۔ پالکی، رہوار یاد رفتار، ہاتھی، ٹٹو، گھوڑے، سب خرامان کرامان

پوقدمے، رنگیوں، چھیل چھبیلوں کی بن آئی ہے۔ نکیلے، بانکے حلوہ نمائی
میں مصروف ہیں۔ کوئی تو گلوریوں کا خون کررہا ہے اور کوئی گانے میں
مست۔ کسی کو نظارہ بازی کی سوجھی ہے۔ ایک متوالا جس کے شملے کے
پیچ گلے میں آ گئے ہیں۔ لڑکھڑا تا ہوا میاں نصیر کے خیمے کے قریب
پہونچکر ''میاں نصیرا و میاں نصیرا و میاں خدا تجھے سلامت رکھے۔'' ۱۵

پیر مرد (جگت نانا) سب کو چھیڑتے ہیں اور سب کی ہنسی مذاق اڑاتے رہتے ہیں میلے میں ان کو ایک مہوش نامی عورت پیر مرد کو چھیڑتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''پیر مرد: (قلندر سے) بھائی اگر مہوشانِ خلخ و نوشا۔ اس پر بزاد کو
کنکھیوں سے بھی دیکھ لیں تو واللہ بندۂ بے دام بن جائیں۔ آہستہ سے
دونوں نے اس البیلی نکیلی سے کہا کہ اس وقت تمہاری رفتار گیب دری
سے کم نہ تھی۔ خیمے میں تمہارا آنا ہم کو مبارک اور ہم تم کو مبارک۔
مہوش: خدا آپ کو بھی مبارک کرے۔ مگر آپ کی وضع مجھے نرالی معلوم
ہوتی ہے۔ میں نے کہیں آپ کو دیکھا ہے مگر اب کے اور اس روز کے
لباس میں کچھ فرق ہے۔
پیر مرد: وہ کس روز تم نے دیکھا تھا۔ میں نے تو تمھیں آج ہی دیکھا
مہوش: (اپنی ہمجولی سے کچھ بات کرکے) آپ با باشرف الدین
صاحب کے عروس میں چائے کی دکان لگا کر بیٹھے تھے۔ ہم نے چار
پیالیاں چائے کی بھی آپ سے لے کر پی تھیں۔ آج یہ مصاحب کیوں
کر بن گئے (میاں نصیر مسکرا کر خموش)'' ۱۶

کشن پرشاد شاؔد نے ''بزمِ خیال'' کے حصّہ دوم میں مختلف علوم اور کھیلوں کی تفصیلات پیش کی ہے۔ اس کے علاوہ اس ناول میں انھوں نے جگہ جگہ فارسی اشعار کو بھی استعمال کیا ہے۔ اس ناول میں ظریف الدولہ عرف جگت نانا کا کردار ''فسانۂ آزاد'' کے خوجی سے ملتا جلتا ہے۔ ظریف الدولہ ہمیشہ چھیڑ چھاڑ اور ہنسی

مذاق کرتا رہتا ہے اقتباس ملاحظہ ہو:

''ظریف: ارے میاں ابھی ابھی تمہارے ڈرانے سے کئی سیر گوشت گھل کر پانی پانی ہو گیا۔

نصیر: (ادب کے پیرائے میں) واقعی نانا خیر گذری کہ انسان خاک کا پتلا ہے اگر برف کا ہوتا تو واللہ سب پگھل کر رہ گئے تھے۔''۱۷

نواب کے گھر خانساماں رہا کرتا ہے وہ نواب کے سب کام کرتا ہے اور نواب کو حسب ضرورت چیزیں مہیا کرتا ہے۔ جب نواب صاحب اور ان کے دوست احباب سندر پلی جانے کا ارادہ کر لیتے ہیں اور نواب خانساماں سے سفر کا انتظام کرنے کو کہتے ہیں اقتباس ملاحظہ ہو:

''نواب: جی نہیں۔ طائفہ وغیرہ تو صرف رسم شادی وغیرہ میں دل بہلانے کے لیے ٹھیک ہے وہ بھی آپ لوگوں کی خاطر سے۔ غرض نواب۔ رفیق اور ظریف الدولہ یہ تینوں راستے میں باتیں کرتے ہوئے گاڑی تک پہونچے۔ اور گاڑی پر سوار ہو کر مکان میں داخل ہوئے۔ خانساماں کو بلا کر حکم دیا کہ کل سندر پلی جائیں گے۔ گاڑی رزروڈ کرنے کے لیے حشمت اللہ منشی سے کہہ دیا جائے۔''۱۸

یہ سب بیٹھ کر سندر پلی کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ اسٹیشن پر ریل رکتی ہے۔ میاں ظریف الدولہ مٹھائی لینے کے لئے ریل اترتے ہیں اور وہاں مٹھائی والے سے گفتگو کرتے ہیں اقتباس دیکھئے:

''ظریف: ارے مٹھائی والے، او مٹھائی والے، اِدھر آ، ادھر آ،

خوانچہ والا: ہوت (خوانچہ لیکر آیا)

ظریف: پہلے تو یہ بتا یہ کونسا اسٹیشن ہے۔

نواب: لاحول ولاقوۃ۔ وہ تختے پر نام لکھا ہے پڑھ کیوں نہیں لیتے۔

قلندر: اندھا ہو گیا ہے۔

ظریف: بھئی اس وقت تو بھوک کی دھن میں اونٹ بھی سجھائی نہیں دیتا۔ ذرا مٹھائی تو لینے دو۔

خوانچے والے سے کیوں بھیا یہ برفی کتنے سیر دو گے۔

خوانچہ والا: روپیا سیر۔

ظریف : انھ، سچ کہو۔ آٹھ آنے سیر دو گے۔

خوانچہ والا: نا صاحب

ظریف: بھلا بارہ آنے سے۔

خوانچہ والا: کیا فرماتے ہیں رپیا سے ایک پھوٹی کوڑی کم نہیں دینگے۔

ظریف: (جھنجلا کر) تیری ایسی تیسی۔

خوانچہ والا: زبان سنبھال مٹھائی خریدو گے یا زبان سے گالی گپت کرو گے۔''۱۹

اس ناول میں مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد نے تعلیم اور اخلاق کی طرف توجہ کی ہے۔اس کے علاوہ تاریخی واقعات کو بھی بیان کیا ہے۔مختلف علوم کو بھی بیان کیا ہے۔میانجی اور ظریف کی گفتگو سُنیے۔

میانجی: (روکھے ہوکر) واہ اچھی تہذیب ہے۔میاں تہذیب سیکھو آدمی کے لئے تہذیب لازم ہے۔

ظریف: دل میں سوچے کہ سنا دوں ایک دو بے بھاؤ کی مگر پھر کہا نہیں۔ ابھی ان کی حماقت کا اور امتحان کرنا چاہیے۔ یہ سوچ کر دست بستہ کھڑے ہوکر کہا کہ مولانا اس پیر بالغ کو مدرسہ میں تعلیم دلانے کے لئے لایا ہوں۔اس کو فرزندی میں قبول فرمایئے۔''۲۰

حیدرآباد میں محاورہ ہے کہ جب کوئی زیادہ کھانے کا شوق رکھتا ہے یا زیادہ کھالیتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ ''تمہارا پیٹ ہے یا عنبر پیٹ'' کشن پرشاد شاؔد قلندر کی زبان سے یہ محاورہ ادا کروایا ہے۔اقتباس دیکھئے۔

''قلندر: معاذاللہ تمھارا پیٹ ہے یا عنبر پیٹ۔ پانچ بجے صبح کے دو پراٹھے نوش جان کیے۔ حلوا خوب زہر مارا کیا اور اب پھر اشتہار موجود''۔۲۱

نواب اور رابرٹ میں گفتگو ہوتی ہے۔ رابرٹ عربستان کے بارے میں بتاتے ہیں رابرٹ عربستان کا سفر کر چکے تھے۔ وہاں کے ماحول، پیداوار، پھلوں اور عربستان کے جغرافیہ کے بارے میں تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔اس ناول میں بھاکا زبان کو بھی استعمال کیا گیا ہے۔ بھاکا زبان کی تعریف اور اشعار بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ایک شعر ملاحظہ ہو۔

سجن سکارے جائیں گے اور زمین مرینگے روے
بدھ نا ایسی رین کر کہ بھور کبھو نہوے

بھاکا زبان کی تعریف اس طرح کی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''نواب: (قلندر شاہ سے) استاد واقعی بھاکا کیا پیاری زبان ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ البیلی، نئ نویلی، دلہن کی الھڑ پن کی چال ہے۔ بخدا نہایت ہی دلچسپ زبان ہونے کے علاوہ جو مضامین اس کے دامنِ خیال میں سما سکتے ہیں اردو ممکن نہیں''۲۲

اس کے علاوہ اردو زبان کی تعریف بھی کی ہے۔نواب اور قلندر کی گفتگو سُنیے ۔

''نواب: استاد اردو بھی اپنے رنگ میں لا جواب ہے۔گو بھاکا کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔تاہم اس کی مستانہ دلآویز چال بھی دل لُبھانے کے لیے کم نہیں ہے۔

قلندر: بیشک آپ کا خیال صحیح ہے۔ اردو نے اپنا سکہ ملک بہ ملک بٹھا دیا۔اور گوشے گوشے میں اس کا نقش نقش کا الحجر ہو گیا۔ یہ زبان اگر خیال کیا جائے تو عالمگیر ہوگئی ہے اور اس کے لوہے کو سبھی نے مانا ہے اور جزئیات وکلیات کا مدار اسی زبان پر ہے۔ دفاتر کی زبان یہی ہو چلی ہے۔''۲۳

نواب اور قلندر حیدرآباد میں اردو زبان کی ترقی کی طرف اپنی گفتگو میں اشارہ کرتے ہیں جس سے اس زمانے کی زبان کی صورتِ حال کا اندازہ ہوتا ہے۔اقتباس دیکھئے:

''نواب: ہمارے حیدرآباد کی زبانِ اردو نے بہت کچھ ترقی کی ہے۔

قلندر: کیا شک ہے۔ ورنہ یہاں کی خاص زبان تو بالکل اپنا رنگ روپ سب سے علحیٰدہ رکھتی تھی۔ فی نفسہ اردو اپنے بے مثل حُسن اور جادو بھری وضع اور بانکپن میں نرالی ہے۔ لیکن بعض بھدّے (الفاظ اور ثقیل کلمات کی آمیزش سے اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کے خوش نما آئینہ سیما عارض پر کسی قسم کا دھبّا نہ آجائے۔'' ۲۴؎

اردو زبان کی تعریف کے بارے میں نواب اور قلندر کی گفتگو ہوتی ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد شآد نے بہت ہی شیرین الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''نواب: استاد یہ تو کہیے کہ زبان کی قدر نثر سے ہوتی ہے یا نظم سے۔

قلندر: بات اچھی پوچھی۔

اس کا فروغ شعراء کی بدولت ہوا ہے اور شعراء بیگمات کی زبان کے احسان مند ہیں۔ باوجود اس کے کہ بڑے بڑے مشہور ومعروف نثّار گزرے اور موجود ہیں جنھوں نے اپنا جھنڈا اس زمین میں گاڑ دیا اور جن کے ڈنکے بجے ہوئے ہیں۔ لیکن میدان شعرا کے ہی ہاتھ رہا۔ شعرا کے ہی دامن عاطیفت میں اس زبان نے پرورش پائی ہے اسی لیے زبان کے مسائل اور باریکیاں اور تنقید اور تحقیق سے بکّلِ وجوہ شاعر ہی کو سروکار ہے۔ دیکھ لیجئے کہ گرفت ہوتی ہے تو شاعر کی ہی زبان کی اور سند لی جاتی ہے تو شاعر ہی کے زبان کی اور سند لی جاتی ہے تو شاعر ہی کے کلام سے ارباب لغت شاعروں کے کلام سے استاد کرتے ہیں۔

نواب: واقعی استاد آپ کا کیا کہنا۔ بالکل درست ہے اور مجھے لفظ بہ لفظ اس سے اتفاق ہونا کیا معنی میں سچ کہتا ہوں کہ آپ کی بدولت بہت سے نکات معلوم ہوئے۔'' ۲۵؎

اس کے علاوہ اس ناول میں مختلف علوم جیسے نظام شمسی، علم نجومی، علم رمل وغیرہ کے بارے میں بیان کیا ہے۔اس کے علاوہ مختلف مورخین کے بارے میں مختصر طور پر بیان کیا ہے جس سے اس دور میں علمی اہمیت کیا تھی اس کی قدر کس طرح کی جاتی تھی اس کا پتہ چلتا ہے۔

اس دور میں بیگموں کی خدمت کے لیے اور ان کے لڑکیوں کی دیکھ بھال کے لئے ماما ئیں، خواص، لونڈیاں اور خادمہ ہوا کرتی تھیں۔ یہ گھر کے سارے کام کرتے تھے اور حیدرآباد کی چند ماما ئیں پکوان کے لئے مشہور تھیں۔مغلانیاں، ماما ئیں لڑکیوں کے طرف سے پیغام بھی لے جاتی تھیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''آس پاس اردگرد جو عورتیں سو رہی تھیں ان میں دو لونڈیاں بھی تھیں۔ ایک چمپا اور دوسری نرگس۔بس آنکھ کھلنا تھا کہ پلنگ سے اٹھ کر دیکھا تو سب چاروں شانے چت۔ جھلا کر پکارا چمپا او چمپا۔مگر جوابی ندارد بڑھیاں جو سو رہی تھیں ان میں سے ایک دو نے جواب دیا۔اب تو چمپا کی بھی آنکھ کھلی۔مگر ابھی ہوشیار نہیں۔''۲۶

اس طرح ناول میں انھوں نے مزاحیہ کردار کے ذریعہ اس زمانے کے سماجی ناہمواریوں پر طنز بھی کیا ہے۔ظریف کا کردار ملاحظہ ہو:

''قلندر نے کان کے پاس جو چیخ لگائی۔ الٹ کر حضرت زمین پر گرے۔جَلَّ جَلَالَہٗ۔شہنائی گود میں آ رہی۔آگ سے جو چرکا لگا تڑپ کر اٹھے اور سب نے دوڑ کر آگ بجھادی۔

ظریف: (بگڑ کر) یہ کس ظالم کی حرکت ہے۔ ہو نہ ہو چھمن بھٹ کی شیطنت ہے۔

چھمن بھٹ: اجی حضرت مجھ بے چارے غریب بامن پر کیوں بگڑتے ہو۔طویلے کی بلا بندر کے سر''۲۷

ہماری بیگمات اور خواتین کبھی آزادی کا پروانہ پانے کی مستحق نہیں ہوسکتیں۔ بیگمات کی سوسائٹی کی اکثر مصاحبین جو عموماً ہوتی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔آتوں جی، مغلانی، ماما، مہری، اور کہاری، باندی، خواتین

وغیرہ وغیرہ۔ یہی ہندوخواتین کی مجلس کے گلدستہ کے منتخب پھول ہوتی ہیں۔اس لیے کہ ہندواور مسلمانوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔لیکن بلحاظ وقوم کے ان کے پاس برہمنیاں بھی محفل میں دخیل ہوتی ہیں۔

میاں بیوی کوایک دوسرے سے کس طرح پیش آنا ہےاورایک دوسرے کی قدر کرنا چاہئے اخلاق کی باتوں کونصیر کے مکالمے سے اجاگر کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''نصیر: جن کوہم بقول آپ کے ہرطرح سے دوست سمجھتے ہیں ان کے سامنے ہم اپنی عورات کو جونہیں نکالتے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم ان پر نعوذ باللہ بھروسہ نہیں کرتے بلکہ اپنی مستورات کی عدم لیاقت اور بے علمی کے سبب سے شرماتے ہیں دور کیوں جائیں۔ ہماری طرز معاشرت پرغور کیجئے کہ اگرشوہرمہذب اورخواندہ تعلیم یافتہ ہے۔اوراگر اس کی عورت و قیانوسی خیالات کے دامن میں پرورش پائے ہوئے ہے۔ اور الف کے نام بھالانہیں جانتی اور سوا ما ما معلانی گھر کی چھوکریوں باندیوں کے جیسا کہ ابھی ذکر کر چکا ہوں یا بیش از یں نیست کواپن جاہل ہمجولیوں یا قرابت داروں کی روش پر زندگی بسر کی ہوایسی عورت کی صحبت اس لائق مرد کے حق میں صحبت ناجنس سمجھی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام عمر نہ میاں بیوی سے خوش ہوتا ہےاور نہ بیوی میاں سے راضی۔ تو پھر آپ ہی انصاف کیجئے کہ انچہ بہ خود نہ پسندی بہ دیگران ہم پسند کیا اس مرد کی ہمت کا اقتضا یہ ہوگا کہ ایسی عورت کوایک لائق اورشائستہ اورمہذب قوم یورپ کے روبرو بے پردہ کر کے نکالے اور ان کی سوسائٹی میں بار دے۔ بخدا جنٹلمینوں کی سوسائٹی میں عموماً اہل یورپ کی کل لیڈیوں سے بھی پردہ کرانا برا نہ ہوگا۔اوریہی وجہ ہے کہ بعض لوگ جوشائستہ اورتعلیم یافتہ ہیں اورجن کی قسمت میں ایسی بیویاں جن کوسوا خدمت گذاری کے کسی بات سے مس

نہیں ملجاتی ہیں ایسی عورات کو ایسی سوسائیٹوں سے پردہ ضرور کراتے
ہیں۔''۲۸

تقریر ختم ہونے کے بعد نواب، ظریف قلندر کھانا کھانے کے لئے جاتے ہیں۔ کھانے کے وقت جو گفتگو ہوتی ہے انھیں کے زبان میں سنیے۔

''نواب: چلئے کھانے پر باتیں ہونگی۔

ظریف: کیا میاں اور بھی باتیں ہونگی۔ ایسا ہے تو بندے کا کھانا علیحٰیدہ
مرحمت ہو۔

نواب: نہ نہ، نانا ایسا غضب نہ کیجئے۔ دیکھئے تو اگر آپ کا جی لگے نوفہو
المراو۔ ورنہ باتیں ختم کردیں گے۔ اور آپ جو کچھ کہیں گے وہ سنیں
گے۔

ظریف: (خوش ہوکر) میاں اللہ تمھیں سلامت رکھے۔

قلندر: اے سبحان اللہ۔ کس قدر پھول گیا۔ جیسے مراہوا گدھا۔

ظریف: لاحول والاقوۃ۔ پھر کالی بات منہ سے نکالی۔ یہ ٹوٹنے ٹانے کی
سند نہیں۔ یعنی (مرنے مارنے) کی بات اچھی نہیں۔ نواب اور قلندر
جا کر میز پر بیٹھ گئے۔

ظریف: میاں ہمیں میز پر کھانے سے معاف رکھیے۔

نواب: نہیں۔ نانا۔ آپ کو ہاتھ سے کھانے کی اجازت ہے۔ آج کوئی
دعوت نہیں ہے کہ مہمان کا لحاظ اور تکلف ملحوظ رہے۔ کھانا شروع ہوا۔''

۲۹

اس ناول میں مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد نے مذہب کے بارے میں نواب کے کردار سے اچھی تقریر پیش کی ہے۔ شاؔد اپنے خیالات کو نواب کے کردار سے ادا کراتے ہیں۔ نواب اور قلندر میں مذہب کے بارے میں جو گفتگو کرتے اس سے اس زمانے کے مذہبی خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقتباس دیکھیئے:

''مذہب اس اشارہ کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے اہلِ دین اپنی منزل تک پہونچتے ہیں اور یہ عبادت الٰہی سے متعلق ہے عبادت الہیٰ کے لیے کوئی خاص طریقہ معین نہیں ہے جس طرح جو کوئی چاہے اس کے دربار میں حاضر ہو کر حصولِ ملازمت کا شرف حاصل کرسکتا ہے۔ الطریقُ الی اللہِ بَعد دانفاس الخلائق مگر افسوس یہ ہے کہ اس مقصود اصلی سے ہم بہت دور ہیں۔ ہم تو فقط ان جھگڑوں میں اپنی زندگی بسر کررہے کہ ہمارا مذہب بڑا ہے سب سے ہمارا دین ناسخ ہے اور دوسروں کا منسوخ۔ اس نے نماز ہاتھ باندھ کر کیوں پڑھی۔ اور فلاں نے ہاتھ کھول کے کیوں عبادت کی۔ یہ بُت کیوں پوجے جاتے ہیں۔ شوالوں میں گھنٹے کیوں ہیں۔ اور کلیساؤں میں صلیبیں کس لیے رکھی گئیں۔'' ۱۳۰

اس کے علاوہ ایک اور جگہ مہاراجہ نے اخلاق وحسنہ کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور اخلاق پر جو بڑے اثرات پڑ رہے ہیں اسی کی سب سے بڑی وجہ تعصب اور جہالت کو قرار دیا ہے مہاراجہ لکھتے ہیں:

''ہماری جہالت نے نہ صرف ہم کو یہیں تک خراب کر رکھا ہے۔ بلکہ ہمارے اخلاقِ حُسنہ جو تعصب کی بدولت خراب ہو رہے ہیں یہ علٰحیدہ ہم کو بدنام کررہے ہیں جہاں اخلاقی کمزوری ہوئی اور دل و دماغ سے عدل وانصاف کی قوت تشریف لے گئی۔ بس غور کرنے کی جگہ ہے کہ جب ہمارے دل و دماغ انصاف کرنے کے قابل نہ رہے اور اخلاق بھی بگڑے تو فلسفہ رہا ہی کیا۔'' ۱۳۱

اس زمانے کی مجلسی زندگی میں مشاعرہ، قوالی، موسیقی کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ اس حوالے سے دوست واحباب جو مجلس کے پروانے سمجھے جاتے تھے اس میں ملاقات کرتے، دل بہلایا کرتے تھے۔ مجلس محفل کے بارے میں مہاراجہ لکھتے ہیں:

''اس وقت شب کے نو بجے ہیں نواب ذیشان ڈنر سے فارغ ہوکر

زنانے سے مردانے میں برآمد ہوئے۔رفقا اور احباب جوان کی مجلس
کے پروانے سمجھے جاتے ہیں۔حاضرین سب سے تپاک کے ساتھ
ملاقات کی اور اپنی کرسی پر جاگزین ہوئے۔حاضرین جلسہ یہ لوگ
تھے۔رفیق حکیم، ولایت حسین، قلندر، ظریف الدولہ، مولوی شیخ امام علی
مولوی شیخ امام علی صاحب خاص طور پر آج مدعو ہیں۔نواب نے
خانساماں کو حکم دیا کہ قوال طلب کئے جائیں۔چنانچہ قوال حاضر ہوئے
اور بعد مجرے کے اپنے طنبورے کا ٹھاٹھ درست کر کے پہلے مبارکباد
گائی۔اس کے بعد حسب فرمائش یہ غزل شروع کی۔

دوش دیدم کہ ملایک درمیخانہ زوند
گلِ آدم بسر شتنہ وبہ پیمانہ زوند''۳۲

اس طرح جلسہ ختم ہوتا ہے۔ایک شب کو نواب، قلندر، میاں ظریف الدولہ اور مولوی شیخ امام علی صاحب سب پا پیادہ کھنڈروں کو دیکھنے کے لئے نکلتے ہیں۔راستے میں ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ مہاراجہ نے جہاں کہیں متن ظرافت پیدا کرنے کی کوشش کی وہ اکثر جلسوں پر ان کی ظرافت مذاق اور پھکڑ پن کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ناول میں لطف پیدا کرنے کے لئے گپوّں اور سطحی مذاق کا سہارا لیا ہے۔ جگت نانا ظریف الدولہ کا کردار بہت لطف دیتا ہے۔ان کی حماقتوں کا اعادہ ہنسائے بغیر نہیں رہتا۔ظریف خود کو ہاشمی نسل کے بتاتے ہیں اور اندر سے بہت کمزور رہتے ہیں۔ہر چھوٹے دکھ سے وہ گر پڑتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''نواب: اجی نانا راستے میں زیادہ بکواس نہ کرو۔لوگ سنیں گے۔
ظریف: تو کیا آپ چوری کے لئے نکلے ہیں یا ڈاکہ ڈالنے کے لئے
ہے کیا کوئی سنتا ہے تو سنا کرے۔
مولوی صاحب: ایسا نہ ہو کہ پولیس ہم کو چور ہی سمجھ کر گرفتار کر لے۔

قلندر: ایسا تو ضرور ہونے والا ہے۔
ظریف: ہوں مجال کیا کسی کی جو ہاشمی تیغ کا مقابلہ کر سکے۔ البتہ ان کھنڈروں کے نشیب و فراز سے اندیشہ ہوتا ہے کہ منہ کے بل نہ گر۔۔۔
ابھی یہ فقرہ تمام نہ ہونے پایا تھا کہ دفعتاً ٹھوکر کھائی اور دھم سے گرے۔ اِلاّ اللہَ ۔مگر مولوی شیخ امام علی صاحب نے بہت پھُرتی سے سنبھال لیا اور سب نے قہقہہ لگایا۔''۳۴

اُدھر ایک گھر سے میاں بیوی کی زور زور سے باتوں کی آواز آتی ہے۔ نواب، ظریف، قلندر، مولوی صاحب سب خاموشی سے ان کی باتیں سننے لگتے ہیں۔ مہاراجہ نے اپنی مکالمہ نگاری سے اپنی کردار نگاری کو جاندار بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مکالمے نہ صرف اس کردار کی انفرادیت کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ مختلف طبقے کے لوگوں کی زبان و لہجے کو بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنی باتوں اور گفتگو کے لہجے سے پہچانے جاتے ہیں۔

ان مکالموں کو مہاراجہ کشن پرشاد شاد نے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''بیوی: اپنا وطن چھوڑ کر تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ یہاں بھی آخر نامرادی نے اپنی صورت دکھائی۔

مرد: صبر کرو۔ سب پر ایسا وقت آتا ہے خدا کی قدرت میں کسی کو دخل نہیں۔

عورت: بس بس وہ مثل تم پر ہی صادق آتی ہے۔ دِلّی میں رہ کر بھاڑ جھونکا کئے۔

مرد: پھر بُرا کیا۔ آخر اپنے ہی وطن میں بھاڑ جھونکا یہاں جب سے آئے ایسا تو اتفاق نہیں ہوا۔

عورت: بھگوان کی قسم تمھاری یہی باتیں مجھے بُری معلوم ہوتی ہیں۔ میں نے دِلّی سے چلتے وقت ہی تم کو ٹوکا تھا کہ دیکھو اپنا وطن نہ چھوڑو۔ جس طرح گزر رہے ہیں گذار لو۔ مگر تم نے نہ مانا۔ تمھیں تو بہت بڑا اغرّا تھا کہ حیدرآباد میں بہت سے کھتری

ہیں کسی سے رسم پیدا کر کے مدارالمہام کے پاس پہونچوں گا۔
اور وہاں ٹِلّی جم جائے گی۔ ابھی تو چھ مہینے بھی نہیں گزرے کہ
طوفانی ٹِلّی جم گئی۔

مرد: آخر تمہاری مرضی کیا ہے کیوں اتنے زور سے باتیں کرتی ہو۔
راستہ چلنے والے کیا کہیں گے۔

عورت: کیا کہیں گے اور اگر کہیں تو کہنے دو۔ کیا کوئی سنے گا تو یہ نہ
کہے گا کہ اپنا وطن چھوڑ کر یہاں آئے اور سارا اثاثہ اور نقد دریا
کے حوالے کر کے روٹیوں کے محتاج بیٹھے ہو۔''۳۴؎

اس وقت حیدرآباد میں یعنی 1908ء میں طغیانی آئی تھی۔ اس طغیانی کی وجہ سے حیدرآباد کے بہت سے لاکھوں کی تعداد میں گھر برباد ہو گئے۔ میاں بیوی سے۔ بچے ماں سے دور ہو گئے۔ یہ بہت بڑا خطرناک حادثہ تھا جس کے سب شکار ہو گئے تھے۔ اس ناول میں طغیانی کا بھی ذکر مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد نے کیا ہے۔

اس کے علاوہ مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد اس ناول میں مختلف کھیلوں کا ذکر بھی کیا ہے جیسے شطرنج، بساط، پولو، تاش، برج وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ اس ناول میں انھوں نے مختلف علوم کے بارے میں بھی ذکر کیا ہے۔ جیسے علم رمل، علم نجوم، سائنس اور اس کے علاوہ تاریخِ سیاست، کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہی نہیں انھوں نے اس ناول میں مختلف ملکوں کا جغرافیہ اور مختلف سائنس دانوں کا مختصر طور پر ذکر کیا ہے۔ اور اس ناول میں اردو، فارسی اور عربی کے علاوہ انگریزی زبان کا بھی استعمال کیا ہے۔ یہ مہاراجہ کی مہارت تھی کہ انھوں نے اس میں ان تمام باتوں کی تفصیل لکھی ہے۔ اور اس ناول کا پورا دار و مدار نواب ظریف الدولہ پر منحصر ہے۔ ظریف الدولہ عرف جگت نانا اس ناول کی جان ہے جو ہر ایک سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا ہے اس کا کردار ''فسانۂ آزاد'' کے خوجی جیسا ہے۔

اس دور میں نوابوں کے گھر خادمہ، مغلانی، مامائیں رہا کرتی تھیں۔ ہماری اس ناول کی ہیروئن سپھر آرا کے ہاں بھی ایک خادمہ تھی وہ سپھر آرا اور نصیر کی راز دار بن جاتی ہے۔ اور ایک دوسرے کو پیغام پہونچایا کرتی ہے۔ سپھر آرا اپنے ایک رشتے دار کے گھر میں میاں نصیر کی تصویر دیکھتی ہے اور اس پر فدا ہوتی

ہے۔ جب نصیر کو پتہ چلتا ہے کہ سپھر آرا پڑھی لکھی ہے تو وہ بھی سپھر آرا سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر نصیر کے والد نواب صاحب میاں نصیر کا رشتہ اپنے رشتے داری میں کرنا چاہتے ہیں اوران کو بات بھی دے چکے ہیں۔ نصیر کو پتہ چلتا ہے کہ وہ لڑکی تعلیم یافتہ نہیں ہے تو صاف انکار کردیتا ہے کیوں کہ وہ ولایت جا کر علم سیکھ کر آیا تھا اسی وجہ سے وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے اس کا اظہار نصیر خط کے ذریعہ کرتا ہے۔

اس ناول کی ہئیت میں کافی تنوع ہے۔ ہئیت میں تبدیلی بھی حالات کی تبدیلی اور سماجی تبدیلی کی غماز ہوتی ہے۔ چونکہ اس لئے ناول کی ایسی ہئیت اختیار کی گئی ہے جو زیادہ سے زیادہ اندرونی احساسات اور جذبات کی عکاسی کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول میں ڈائری اور خطوط کا طریقہ بھی اختیار کیا جاتا ہے۔

ظریف الدولہ عرف جگت نانا میاں نصیر کا خط نواب صاحب کو پہونچاتے ہیں اوران کو شادی سے بھی راضی کر لیتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد نواب صاحب بھی راضی ہوجاتے ہیں اور یہ پیغام سپھر آرا کے والد منصف دار کو پھر پہنچاتے ہیں تو ادھر سپھر آرا اور مغلانی بہار سب خوشی سے جھوم اٹھتے ہیں اور ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتی ہیں۔ اور چائے نوش کرتی ہیں اقتباس انھیں کی زبان سے سنیے۔

مغلانی: ادب سے صاحبزادی چائے نوش فرمالیں۔

نو بہار: (سپھر آرا سے) بیوی آپ چاہیں باندی کو جس طرح منظور ہو سزا دیں۔ مگر باندی کے ولی جوش کو آپ روک نہیں سکتیں۔ یہ کہہ کر جھٹ چائے کی کشتی لا کر سامنے رکھ دی۔

> سپھر آرا نے خود بھی چائے پی اور نو بہار اور مغلانی کو بھی چائے نوش کا حکم دیا۔ ان دونوں نے آداب بجالا کر چائے پی۔ سپھر آرا نے گلوریاں کھائیں اور آج خود اپنے ہاتھ سے گلوریاں بنا کر مغلانی اور نو بہار کو عنایت فرمائیں۔ یہ علامت سپھر آرا کی مسرتِ دلی اور اظہار عنایت کی ہے۔ دونوں نے پھر آداب بجالا کر گلوریاں لیں اور بیٹھ گئیں'' ۳۵

جب ماں باپ لڑکی شادی کے بارے میں پوچھتے ہیں تو لڑکیاں شرما جاتی ہیں اور اپنے سروں کو جھکا لیتی ہیں یہ تہذیب کی خصوصیت ہے۔ مہذب یافتہ لڑکیاں اپنی تہذیب پر قائم رہتی ہیں اور وہ والدین کا احترام کرتی ہیں۔ شادی کے بارے میں مغلانی سپھر آرا سے پوچھتی ہے تو یوں جواب دیتی ہے اقتباس

انھیں کی زبان سے سُنیے:

''مغلانی: مجھے اس لیے بلایا تھا کہ میں اپنے طور پر آپ سے یہ دریافت کروں کہ آپ شرعی عقد کو پسند کرتی ہیں یا رسوم کے ساتھ بیاہی جانا منظور فرماتی ہیں۔

سپھر آرا: اوئی یہ بھی باتیں پوچھنے کی ہیں۔کیا دنیا میں دستور ایسا ہی ہوتا ہے کہ انبیا ہی لڑکیوں سے ایسی باتیں پوچھیں۔

مغلانی: باندی نے جب ہی عرض کیا کہ صاحبزادی ہرگز اس بارے میں اپنی رائے نہ دینگی بلکہ آزردہ ہو جائیں گی۔

سپھر آرا: بہت خوب کیا۔بعض وقت تو اماں جان کچھ ایسی بھولی بھالی باتیں کرتی ہیں کہ بس۔''۳۶

اس دور میں نوابوں کے گھروں میں نوکر، چاکر، خانساماں، ماما گارڈن، خواص مغلانیاں رہا کرتی تھیں۔خانساماں نواب کے گھر میں خادم تھا جب مغلانی نصیر سے ملنی آتی ہے تو خانساماں مغلانی کو نصیر کے یہاں پہونچاتا ہے۔اقتباس دیکھئے۔

''خانساماں بھی اس وقت اپنی نشست میں خس کی ٹٹی کے قریب بیٹھا ہوا پنکھا جھل رہا تھا۔فوراً یا اللہ میرے۔کس وقت پھر نیک بحت آٹی کہہ کر اٹھا۔اور سر پر پگڑی رکھ لی۔انگرکھا پہن لیا۔کمر کس کر خوابگاہ کے قریب پہونچا۔ وہاں کے خدمتی سے دریافت کیا کہ سرکار کیا کر رہے ہیں۔۔۔۔مغلانی کو خانساماں نے خوابگاہ کے قریب پہونچا کر کہا کہ سرکار اندر ہیں جاؤ۔

مغلانی: کیا باندی حاضر ہو سکتی ہے۔

نصیر: آؤ آؤ بے تکلف آؤ۔''۳۷

بیسویں صدی میں صرف ناولوں کی بہتات ہی نہیں رہی بلکہ اس صدی میں مختلف قسم کے ناول لکھے

گئے۔اس دور میں مختلف ناول نگار مختلف قسموں ناولوں کی طرف متوجہ ہوئے کسی نے جاسوسی ناول لکھے کسی نے ہیجانی اور کسی نے مہماتی اور کسی نے سنسنی خیز اور کئی پُر اسرار ناول لکھے تو کسی نے واقعاتی اور کسی نے نفسیاتی اور کسی نے اصلاحی اور کسی نے اخلاقی ناول لکھے۔مہاراجہ کشن پرشاد شآد نے اصلاحی اور اخلاقی ناول لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ اس ناول میں مہاراجہ کشن پرشاد شآد نے ہندوؤں کے خاندان کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ ہندوؤں کے چار ذاتوں کو انھوں نے بیان کیا ہے۔جیسے برہمن، چھتری، ویش اور شودر اس کے علاوہ مہاراجہ کشن پرشاد شآد نے اس ناول میں ہندوؤں کے مقدس تہواروں کے بارے میں بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔تہواروں کا ذکر ختم ہونے کے بعد کشن پرشاد شآد اپنی ناول کو مغلانی، سپھر آرا اور نو بہار کے مکالموں سے پھر سے موڑ دیتے ہیں۔سپھر آرا سے ایک طویل تقریر کراتے ہیں یہ تقریر سپھر آرا بیگم کے گھر خواتین کے جلسہ میں ہوتی ہے۔ محلے کی سب عورتوں کو اس جلسے میں شرکت کرنے کی دعوت دی جاتی ہے اور سب آنے کے بعد سپھر آرا طویل ترین تقریر سناتی ہے وہ اس تقریر میں بیویوں کو اپنے خاوندوں سے کسی طرح پیش آنا چاہئے اور بیوی خاوند کی کس طرح سے خدمت کرتی ہے اس کے فرائض کیا ہیں اس کو بہت اچھے اور سلیقے مند انداز میں بیان کرتی ہے۔اس کی تقریر سے شرکت جلسہ سبھی عورتوں کے عورتوں کے آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔کشن پرشاد نے سپھر آرا کے کردار کے ذریعہ خواتین کی ذمہ داریوں پر توجہ دلائی ہے۔ عورتوں کے فرائض کے بارے میں گہرائی سے مطالعہ کروایا ہے۔اور لڑکیوں کو نصیحت دی ہے اور ان کے اخلاق و کردار کے بارے میں بتایا ہے۔

سپھر آرا کی تقریر سے جلسہ خواتین اور سپھر آرا کی پھوبھی زبیدہ بیگم بہت خوش ہوتی ہیں اور سپھر آرا کو مبارک باد دیتی ہیں۔اسی جلسے میں زبیدہ بیگم یہ بھی اظہار کرتی ہیں کہ ہماری پیاری سپھر آرا کا عقد میاں نصیر سے ہونے والا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''انشاء اللہ تعالیٰ آیندہ ہفتہ میں ایک ایسی نیکبخت خوشرو و خوش سیر، لایق،
سنجیدہ، مہذب مرد کی بیوی اور اس کی آرام جان بننے والی ہے۔''۴۸

سالگرہ منانے کا رواج انگریزی تہذیب کے اثر سے اس معاشرے میں بھی ہو گیا تھا۔ رفیق، نواب، قلندر، رابرٹ، نجومی، ظریف ایک دوسرے کے دوست احباب ہیں۔ رفیق کی دختر نیک اختر کی

سالگرہ ہے۔ رفیق اپنے دوست واحباب کو اپنے گھر پر دعوت دیتے ہیں۔ سالگرہ کی تقریب کا ایک منظر دیکھئے۔

''یہ رفیع الشان مکان نہایت عمدہ منظر پر واقع ہوا ہے لیکن مفلسی قطع کا کمرے ایسے سجے ہوئے جیسے عروس کی خلوت درودیوار سقف وستون آئیل پینٹنگ سے مانی و بہزاد کی یادگار بنے ہوئے ہیں۔ فرنیچر صرف دیوان خانے میں دیوارگیریاں گویا مکان کی زینت بنی ہیں۔ سبز رنگ کے کنول خوشنما خوشترنگ میزبان کی سرسبزی کی خبر دے رہے ہیں۔ ہر ایک کنول دیوارگیریوں اور جھاڑوں کا بیش بہا تھا مومی شمع قدرت انتماد اپنے بائیں ایک ایک جھاباوہ بھی مایل بہ سبزی دری چاندنی شفاف جیسے بگلی کا پر۔ ایک حجرے میں مسہری گنگا جمنی پائی۔ ململ کی پوشتش چھتری میں جھالر لگی ہوئی۔ لیس ٹکی ہوئی۔ ہوائی تکیے پیش میں رکھے ہوئے گلدستے محفل میں جا بجا گل سرسبد بنے ہوئے۔ لولیانِ شوخ وشنگ یعنی طوایف منتخب حاضر ہیں۔''[۳۹]

شادی بیاہ اور جلسوں میں اور شعروشاعری کی محفلوں میں پان کھانا اور پان دینا اور گلوریاں کھانا تہذیب کی ایک نشانی سمجھی جاتی تھی۔ نواب کے دربار میں شعروشاعری کے جلسے ہوتے رہتے ہیں اور پان کی گلوریاں سب کو پیش کی جاتی تھیں۔ ایک منظر دیکھیے

''نور نے گلوریاں بنائیں اور پہلے نواب کی خدمت میں پیش کیں۔ نواب نے آہستہ سے کان میں کہا کہ ظریف کو بنائے مگر رنڈی مغرور حسن تھی ادب سے عرض کیا کہ حضور باندی کو معاف رکھیں کہیں ایسا نہ ہو کہ بوڑھا خلاف تہذیب اس مجلس میں کچھ کہہ اٹھے۔ نواب نے کہا کہ وہ غیر مہذب نہیں ہیں۔ لیکن ہنسوڑ ضرور ہیں۔ نور نے حسب ایماے نواب حاضرینِ مجلس کو بھی گلوریاں دیں۔''[۴۰]

رفیق بھی جلسے میں شامل تھے وہ تہذیب سے پیش آنا چاہتے ہیں لیکن نشہ کی وجہ سے ان کے قدم اِدھراُدھر پڑتے ہیں۔ جلسے میں شراب کا دور بھی چلتا تھا۔بعض لوگ نشے میں تہذیب سے باہر ہوتے تھے اس طرح کا بیان ملاحظہ ہو:

''رفیق تہذیب کو کام میں لانا چاہتے ہیں مگر نشہ کا جب دھاوا ہوتا ہے تو بس ان کی تہذیب کے قدم بھی اکھڑے جاتے ہیں۔ بریں ہم اپنے کو سنبھالے ہوئے ہیں قلندر نے نوافل کی لڑ لگادی۔ابھی تک سجدہ بہ سجود میں ہی ہیں۔''[۱۴]

مہاراجہ شاؔد نے معاشرت کی عکاسی میلوں ٹھیلوں کے مرقع کشی کرتے وقت سادہ وسلیس زبان کا استعمال کیا ہے۔اور مکالمہ بھی عام روزمرہ کی زبان میں لکھتے ہیں۔لیکن جب وہ قدرتی مناظر کو پیش کرتے ہیں تو وہ زبان کو زیادہ سے زیادہ آراستہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی انشاپردازی، تخیل آفرینی، نکتہ دانی، رنگین بیانی کے جوہر دکھاتے ہیں اور مسجع ومقفی عبارت لکھتے ہیں۔اس لئے ان کے مناظر میں حسن ودلکشی تو ہوتی ہے لیکن وہ تاثر پیدا نہیں ہوتا جو کسی ناول کے مناظر کے لئے ضروری ہے اور وہ سادہ وسلیس بیان کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔

رفیق کے گھر میں کھانے کے بعد محفل سجتی ہے اس میں رقص وسرود اور گانا کا انتظام تھا۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''نور کی طرف اشارہ ہوا کہ گانا شروع کرے۔نواب نے ظریف سے کہا کہ نانا بس اب گانا سن لیجئے رات زیادہ ہو رہی ہے۔

نعمانی: جی ہاں واقعی گانا ہونا چاہیے۔

گانا شروع ہوا۔جس غزل کا مطلع یہ تھا۔

فارغ از وسوسۂ گبر ومسلمان کردی

اے جنون گردنو کردم کہ چہ احسان کردی

کچھ ایسی پیاری دَھن میں اس نے اس غزل کو شروع کردیا کہ بس سناٹا

ہوگیا۔نواب بے تحاشا رونے لگے اور نعمانی اور ظریف کے بھی آنسو نکلے۔قلندر دور بیٹھ کر کچھ وظیفہ پڑھتے تھے۔ اِلاّ اللہ کہہ کر اٹھے۔اور رقص کرنا شروع کیا۔خداداد ایک خاص کیفیت سے محفل چورتھی۔ بہت دیر تک یہ ایک ہی مطلع گایا گیا۔بخبر پنڈت کے باقی سب حاضرین مجلس کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ باوجود شامپین وغیرہ کی کیفیت سے مست ہونے کے خاص اس شعر کی معنی پر جو کیفیت ہوئی وہ بالکل پر اثر ہوئی۔اس کیفیت میں کسی دوسرے جز کا میل نہ تھا اور یوں کہنے والے جو چاہیں کہہ لیں۔آٹھ بجے شب کے نواب اور رفقا کھانے سے فارغ ہوئے اور رفیق نے سب کو پھولوں کے ہار پہنائے۔عطر کی شیشیاں دیں۔محفل برخاست ہوتے وقت نواب نے پانچ اشرفیاں نور کو انعام عطا کیا۔سب خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوئے۔''۴۲

جب کسی کے گھر میں شادی کرنا ہوتو دولھا اور دلہن کے گھر والے مل بیٹھ کر بات کرتے ہیں اور شادی کی تاریخ طئے کرتے ہیں۔اور مختلف رسموں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔اس پر اس ناول میں روشنی پڑتی ہے۔

''نعمت علی نواب صاحب کے پاس پہنچ کر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد یہ ذکر چھیڑا کہ شادی کی تاریخ قریب آگئی ہے اور منصبدار صاحب کے محل میں یہ اصرار ہے کہ تقریب تمام رسموں کے ساتھ دھوم دھام سے کی جائے۔منصبدار صاحب نے سلام کے بعد کہا ہے کہ اس معاملے میں جو آپ کی رائے ہو اس پر عمل کیا جائے۔ میں آپ کی رائے کے خلاف کوئی بات نہیں چاہتا۔''۴۳

ادھر سپھر آرا اور میاں نصیر کی شادی کی تاریخ پکی ہوجاتی ہے اور شادی کی دھوم دھام سے تیاریاں ہونے لگتی ہیں۔شادی بیاہ، رسم ورواج، رہن سہن، لباس، مختلف رسومات تہذیب کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔

شادی کی تیاریاں بڑے دھوم دھام سے ہوتی ہیں شادیوں کی تفصیل دیکھئے۔

''ایسے مبارک روز میمنت وقت میں ہمارے نواب فیض مآب کا دولت کدہ ارم کا نمونہ بنا ہوا ہے۔ دروازے پر نوبتی شادیانے بجاتے ہوئے ہر ایک کے دل کو فرحت بخشتے جاتے ہیں۔ براتیوں کی ٹھٹ لگے ہوئے ہیں تماشائی کھچا کھچ آرزؤں کی طرح جمع ہو رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے مبارک باد کا گلدستہ پیش کر رہا ہے اور بیتابی کے ساتھ منتظر ہیں کہ دولھا کب برجِ شادمانی سے جلوہ فرما ہو کر اپنی برات سے تماشائیوں کی آنکھوں کو نور و سرور بخشتا ہے۔ نوابِ فیض مآب بہت ہی شاد ہیں۔''[۴۴]

شادی بیاہ اور مختلف تقاریب میں ہر ایک اپنی اپنی پسند سے لباس پہنا کرتے تھے۔ اور مختلف رسومات انجام دیتے تھے۔ اس دور میں شادی بیاہ میں مختلف رسومات کو انجام دیا جاتا تھا۔ ناچ گانے کے لئے طوائفوں کا انتظام بھی ہوا کرتا تھا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''گلابی رنگ کی اطلس کی قیمتی شیروانی پہنے ہوئے تُری کے پھول کی رنگ کی دستار زیب سر کئے ہوئے گلے میں قیمتی موتیوں کا کنٹھا ڈالے ہوئے انگشتری یاقوت اور الماس کی پہنے ہوئے بیش قیمت چھڑی طلاکار ہاتھ میں زیر پائی عمدہ سادہ زینت پا کئے ہوئے اپنے معزز مہمانوں کی میزبانی میں بفرطِ مسرت مصروف ہیں۔ جو کوئی آتا ہے مبارک سلامت کہہ کر اپنے معزز میزبان سے مصافحہ کرتا ہے بکشادہ پیشانی ہر ایک کے سلام اور مبارک بادی کا جواب دیتے جاتے ہیں۔ جس طرف دیکھو سب کے سب سرخا سرخ نظر آتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ چمن میں گل مہندی کا تختہ کھلا ہوا ہے۔ طوائف ہزار ہا بناؤ سنگار سے نکھر کر چھم چھم کرتی۔ اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر سے باد بہاری کی

طرح اٹھکھیلیاں کرتی پھرتی ہیں۔کوئی اس میں بجھے دل کی نظر نہیں آتی کہ جس نے کس مرد سے چھیڑ چھیڑ کر دو گال ہنس بول نہ لیا ہو۔'' ۴۵؎

دولھا کا لباس اور اس کی آرائش و زیبائش کی تفصیل ملاحظہ ہو:

''صندلی رنگ کی دستار زیب سر ریشمی گلابی رنگ کا قمیص اس پر نہایت قیمتی گلنار رنگ کے مخمل کی شیروانی کارچوب کے کام کی اور چوڑی دار پائجامہ، سرپیچ جواہر کا سرتاج زیبِ سر ہو کر سر بلند ہوا ہے۔سہرا اس پر طُرّہ، سروقد، درازی عمر و اقبال کی خوش خبری دے رہا ہے۔کنٹھا مروارید کا صراحی اور گلے کو بوسہ دینے کی عزت حاصل کر رہا ہے۔پروانہ گھر کی آبرو اس مرتبہ سے دوبالا ہو رہی ہے۔

''بھجبند قوت بازو کا کام دے رہے ہیں۔ یاقوت اور الماس کی انگشتریوں میں زہرہ مشتری کی طرح قرآن السعدین ہے۔ ہر انگشتری کو بجائے خود انگشتری سلیمانی کا رتبہ حاصل ہے۔عباسی ہاتھ میں زیر پائی قیمتی پانوں میں عطرِ عروس دستی میں لگا ہوا چشم بد دور سراپا تصویر بن کر بہارِ نوروز کی طرح داخل ہوا۔'' ۴۶؎

دولھے کو مبارک باد اور نظر بد کی دعائیں دی جاتی تھیں۔کس طرح سے دی جاتی تھیں اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''احمد، محمود، نصراللہ، احمد خاں یہ چاروں بلاتشبیہ چار یار غار وفا شعار، جان نثار دامن سے لپٹے ہوئے صرف ایک احمد خاں ملکی مکلّف لباس میں ہے۔باقی تینوں نئی روشنی کے پروانے ایوننگ ڈریس میں نوشاہ کے عقبِ مسند بیٹھ گئے۔۔۔۔۔جس قدر خیر خواہ تھے سب درازی عمر کی دعا دے رہے تھے اور اکثر نظرِ بد کے لیے دعائیں پڑھ پڑھ کر دم کر رہے تھے۔قلندر شاہ کا نمبر دعا خوانی میں سب سے اول ہے۔ظریف

الدولہ بہادر نے میاں نصیر کے قریب آ کر دعائیں دیں اور بے تحاشا
عورتوں کی طرح فرطِ مسرت سے بلائیں لے کر کہا میاں مبارک ہو۔
اللہ تعالیٰ نے تمھاری آرزو کا کامیابی کے ساتھ جس طرح عقد پڑھایا ہے
اسی طرح آپ کی دلھن کے ساتھ حضرتِ عشق نے شادی کر دیں اور
محبت کا قاضی عقد پڑھائے اور ہماری دعا تم دونوں کے سر پر برکت کا
سہرا بن کر بندھ جائے۔''۴۷

اس دور میں شادی کی تقریب میں طوائفوں کا ناچ گانا ضروری ہوتا تھا۔ اور طوائف کچھ غزلیں سنایا کرتی تھیں اور دولھا کو دعائیں دیتے، مبارک باد دیتے اور بلائیں لیتی تھیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''نوشہ کے سامنے ایک طائفہ حاضر ہوا۔ یہ طائفہ لکھنو کا ہے اس کا حسن
خداداداور اس پر طرفہ عالم شباب اور اس شادی کی محفل میں جو بن سنور
کر ٹھسّے سے آئے۔ جس نے دیکھا سبحان اللہ کہا۔ یہ اپنا تخلص نور کرتی
ہے حاضر ہوتے ہی مجرا کر کے گانا شروع کیا۔

پھر بہار آئی کفِ ہر شاخ پر پیمانہ ہے
ہر روش میں جلوۂ بادِ صبا مستانہ ہے۔

اس عمدگی سے گیا اور بتایا کہ اس کی رسیلی آواز سے ہر شخص نے ذوق
حاصل کیا۔''۴۸

جب دولھا میاں نصیر دلہن کے گھر پہنچتا ہے۔ وہ اپنے باراتیوں کے ساتھ اس طرح پہو نچتا ہے۔ گھوڑوں اور ہاتھی اور ان کے دوست احباب کے ساتھ نکلتا ہے۔ بارات میں کیا کیا چیزیں ہوتی ہیں کس طرح سے ناچتے گاتے شور مچاتے جاتے ہیں۔ کشن پرشاد شآد نے اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے اقتباس ملاحظہ ہو:

''دولھا جب گھوڑے پر سوار ہو کر نہایت تکلیف کے ساتھ دلہن کے گھر
کی طرف چلا۔ سب کے پہلے نشان کا ہاتھی کنجل اکدنتا اس کا نام کوہ

تمکین مستک پر افشاں چنی ہوئی اور سیندور کا رنگ، جھول زربفت کی۔ دو چرکٹے ساتھ، ایک سونڈ کی ادھر ایک ادھر پاؤں میں ہاتھی کے ایک بھاری زنجیر، دس بلم بردار، زردوزی نشان پھریرا اڑ رہا تھا نشان پر نصر مِنَ اللہ و فتح'' قریب ایسے جلی سنہرے حرفوں میں لکھا ہوا تھا کہ ہر شخص دور سے پڑھ سکتا تھا۔ ہاتھی کے بعد نظمِ جمیعت کے راٹھور چھتری جن کا لوہا آج تک مانا جاتا ہے۔ داڑھیوں کو کانوں سے لپیٹے ہوئے بلدار پگڑیاں، بھویں ایسی تنی ہوئیں جیسے کمان، مسلح، جوشِ بہادری چہرے سے نمایاں سب تلوار کے دھنی۔ان کے بعد سندھی جرار و کرار۔ان کے بعد جمعدار پیشہ عمدہ عمدہ گھوڑوں پر سوار اور مہدی پٹھان جیالے ہانکے نکیلے ان کے بعد عروب ضامن بولتے ہوئے شجاعان وعرب مشہور جہاں چار عرب ضامن بولتے ہوئے نکلے تو معلوم ہوا کہ چار سو جارہے ہیں۔شیدی ناچ رہے ہیں۔ یہ وہ سپاہیانہ ناچ ہے کہ ٹھنڈے دل والا بھی گرما جائے اس کے بعد باجۂ مغلی طنبورہ بانسری، انگریزی بیانڈ اور لین کی کئی برادریاں چوبدار ہرکارے اڑے جاؤ، بڑھے جاؤ، نگہہ روبرو، عمر و دولت زیادہ پیش نگاہ کی صدائیں بلند کرتے ہوئے ہر ایش اپنا جوبن اور سنگار جدا دکھا رہی ہیں۔ ہوائیاں نشان کے پاس چھوٹ رہی ہیں۔نوشہ کا صبا رفتار بھی دلہن بنا ہوا۔تڑپ ایسی جیسے برقِ جہندہ زین زردوزی مگر انگریزی فشن کا ایک طرف براتی معزز جاگیر دار جمعدار عزیز و اقارب مصاحب، اہلکار دوسری طرف لولیاں پری چہرہ ہاتھیوں پر جلوہ آراہ تھیں۔ان کی ادائے دلبرنہ ہر ایک کے طائر دل کے ساتھ ناوک فگنی کر رہی تھی۔''۴۹؎

ادھر دلہن سپھر آرا دلہن بن بیٹھی رہتی ہے اور اس کے ساتھ مغلانی اور نوبہار بھی ساتھ میں رہتی ہیں

اور ہنسی مذاق کی باتیں کرتی ہیں اور دلہن سپھر آرا گھونگٹ اوڑھی بیٹھی رہتی ہے۔ گھونگٹ اوڑھنا بھی تہذیب کی ایک نشانی سمجھی جاتی تھی بلکہ آج بھی دلھنوں کو گھونگٹ میں رہنے کی روایت باقی ہے۔

''نوبہار: ہنستی ہوئی اس لیے تو کچھ کا کچھ کہہ دیا۔ خدا نے چاہا تو کل میاں کے سامنے تمھیں ایسا چھپاؤں گی کی یا یہ وشاید۔

سپھر آرا: (نوبہار سے) یہ شام ہونے دو کیا بات تھی۔

نوبہار: اب موقع نہیں۔ ذرا گھونگٹ لے لیجئے۔ وہ مہمان آرہے ہیں۔

سپھر آرا جھٹ سے گھونگٹ لے کر جھک گئی۔ اب سب کے سب ارد گرد اس ماہ نو یعنی عروس کے بیٹھ گئیں۔'' ۵۰؎

جب دلہن اپنے گھر سے رخصت ہوتی ہے تو اس کے والدین سہیلیاں رشتہ دار سب رونے لگتے ہیں یہ بھی شادی کی ایک رسم ہے اقتباس دیکھئے:

''منصبدار صاحب اندر زنانے مکان میں آئے اور اپنی بیوی کو بلوا کر کہا کہ الحمدللہ سب خیریت ہے۔ بس اب عقد خوانی ہوتی ہے۔ اس کے بعد دلہن انشاء اللہ روانہ ہوگی۔ یہ فقرہ ابھی نا تمام تھا کہ گلے مل کر رونا شروع کر دیا۔ منصبدار صاحب بھی خوب روئے۔ پھر سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔'' ۵۱؎

قاضی صاحب آتے ہیں اور نکاح پڑھاتے ہیں اس کے کچھ رسم ادا کرتے ہیں قاضی کا جلسہ کس طرح کا تھا اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

'' قاضی صاحب بُردیمانی در بر اور شملہ بمقدار علم برسر، عقیق کی تسبیح ہاتھ میں لئے ہوئے سر گھٹا ہوا، کفش پانوں میں اللّٰھُمَّ صَلِّ علیٰ کہتے ہو تسبیح کھٹکھٹاتے داخل محفل ہوئے اور اسلام علیکم بڑی اونچی آواز اور قرات کے لہجے میں ارشاد فرمایا۔ اور بیٹھ گئے۔ پہلے قاضی نے سیاہہ

نکاح لکھا۔یعنی دولھا کا نام معہ ولدیت وسکونت، وکیل اور گواہوں کے نام معہ ولدیت مقدار مہر کی تشریح کی۔فاتحہ خیر کے بعد خطبہ پڑھا گیا۔ اور خیر سے ایجاب وقبول ہوگیا۔دولھا پر سے مصری بادام نثار کیے گئے۔ سمدھیوں میں شربت خوری ہوئی۔بعد اس کے طعامِ ولیمہ سبھوں نے چکھا۔نواب نے قاضی صاحب کو ایک جڑاؤ ہار اور 25 اشرفیاں دیں۔ منصبدار صاحب اور نواب ذیشان دونوں اٹھ کر بہت ہی تپاک سے گلے ملے''۵۲؎

اس کے بعد ناچ گانا شروع ہوتا ہے۔سب ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں اور نصیر کے اور نواب کے دوست خوشی سے ایک دوسرے کو گود میں اٹھا لیتے ہیں اقتباس ملاحظہ ہو:

''محمود نے احمد سے کہا کہ تم منصبدار صاحب کو اٹھا لو اور میں نواب صاحب کو اٹھائے لیتا ہوں۔اور نصر اللہ نواب جانی کو۔اور تینوں مل کر رقص کریں گے۔ایسا ہی ہوا کہ ان تینوں نے تینوں کو اٹھالینا چاہا۔ نواب جانی نے کہا کہ مسٹر رابرٹ کو بلا لو کہ وہ نانا کو اٹھالیں گے۔ نصر اللہ دولھا کو اٹھالیں۔''۵۳؎

اب ناچ گانے کی دھوم دیکھئے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''الغرض حسب مشورہ سبھوں نے ایک ایک کو اٹھالیا۔بیانڈ والوں کو حکم دیا کہ یہ غزل بجائیں۔لالہ کرر خاسمن براسرِ رواں کیتی بیانڈ والوں نے نہایت عمدگی سے اس غزل کو بجانا شروع کیا۔اور ان تینوں نوجوانوں نے ادھر اس غزل کی تال پر ناچ شروع کیا۔رابرٹ نے ظریف الدولہ کو گود میں لے کر ایک ایسا چکر لگایا کہ بڑے میاں کے ہوش رفو چکر ہوگئے۔اب تو چیخنا شروع کیا کہ نواب کی دہائی خدا کے لئے اس ظالم سے مجھے نجات دلوانا، تمام محفل میں دھوم مچ گئی اور جس

قدر انگریز احباب جمع تھے۔ سبھوں نے ہرّ ے کے نعرے بلند کئے اور ٹوپیاں اچھالیں۔ ادھر لیڈیز اور جنٹلمین بھی آپس میں رقص کرنے لگے۔ اور اس تال پر بہت دیر تک رقص ہوتا رہا۔ میاں ظریف نے بھی انگریزوں کا تتبع کیا کہ اپنی پگڑی اچھال دی۔'' ۵۴؎

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد شادی بیاہ کے جلسوں کے بارے میں لکھنے کی خوشی کا اظہار کرتے ہیں اقتباس ملاحظہ ہو:

''ناظرین کو بھی یہ خوشی مبارک ہو۔ اور ناظرین دل کے گھروں میں خدا ایسی ہی خوشی کے جلسے منانا نصیب کرے تا کہ شاؔد کو ہر وقت موقع ملتا رہے کہ احباب کے گزرے ہوئے جلسوں کو لکھتا جائے اور پبلک کے روبرو ضیافتِ طبع کے لیے تحفہ پیش کرتا جائے۔'' ۵۵؎

شادی بیاہ میں بہت رسومات انجام دئے جاتے ہیں یہ مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کی مہارت ہے کہ انھوں نے شادی کے تمام رسوم کو بہت سلیقے سے کہانی کی بنت میں شامل کیا ہے۔ شادی میں عقد کے بعد جلوہ کی رسم میں دولھا کو دلہن کی جھوٹی مصری کھلائی جاتی ہے اقتباس ملاحظہ ہو:

''کمسن سالیوں نے دولھا کو دلھن کی جھوٹی مصری کئی بار کھلائی۔ اور جوان سالیاں رشتے کی چھل کرنے لگیں۔

ایک کہتی ہے۔ اوئی دولھا تو جیسے بھوکا ہے کس قدر مصری کھا گیا۔

دوسری: اچھا ہوا کہ میں نے نہ کھلایا۔ ورنہ خدا جانے میری انگلی کتر لیتا تو میں کیا کرتی۔

تیسری: معلوم ہوتا ہے کہ منت کے روزے رکھے تھے آج افطار کیا۔

چوتھی: ابھی کہاں کا افطار۔ بارہ بجے شب کے۔ اس پر تو قہقہ ہوا۔ آرسی مصحف کی رسم میں دولھا نے کوشش کی کہ عروسِ ماہ لقا کا جمال یہیں دیکھے اور موسیٰ کی طرح اِرنی کا سوال کیا مگر حیا نے لنترانی کے جواب

سے محروم کر دیا'' ۵۶؎

جلوہ اور آرسی مصحفی کی رسم کے بعد سلامی کی رسم ادا کی جاتی ہے اس رسم کی تفصیل دیکھئے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ساس نے یعنی سپہر آرا کی والدہ نے داماد کو سلامی میں بیش بہا انگشتری اور جڑاؤ ہار اور دست بند دیا اور نقد پچیس ہزار اشرفیاں گود میں ڈالیں۔ چَٹ چَٹ بلائیں لیں۔ اس طرح درجہ بدرجہ اہلِ برادری نے اعلیٰ قدرِ مراتب سلامی دی۔ دولھا نے خسر کو اور اپنی ساس کو نذر دی۔ ساس نے بلائیں لیں۔ اور اشرفیاں نچھاور کر کے سب کو انعام دیا۔'' ۵۷؎

سلامی کے رسم کے بعد دلہن کو الوداع اس طرح سے کیا جاتا ہے شادؔ نے سادہ اور سلیس انداز سے مکالموں کے ذریعہ ادا کئے ہیں اقتباس ملاحظہ ہو:

''منصبدار اور صاحب نے نواب کو اندر بلوایا اور اپنی نورِ نظر اور لختِ جگر کا ہاتھ نواب کے ہاتھ میں دیکر کہا ؎

سپردم بتو مایۂ خوش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را

دیکھو نواب صاحب آج تک میں نے اور اس کی ماں نے جس طرح پالا پرورش کیا اور جو جو ناز برداریاں کیں اس کی قدر تم کو ضرور ہوگی۔ بہر حال اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھ کر اس گھڑی تک اپنے سے جدا نہیں کیا۔ اب اس امانت کو میں تمھارے حوالے کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر ایک چیخ ماری اور سمدھی سے لپٹ گئے۔ نواب بھی ایک رفیق القلب خدا ترس آدمی ہیں ان کو بھی رقت ہوئی اور دونوں مل کر کیا روئے تمام گھر میں کہرام مچ گیا۔'' ۵۸؎

دلہن اپنے گھر سے رخصت ہوتی ہے اور اس کے رخصتی میں دلہن کے ماں باپ مختلف چیزوں کو

دلہن کے ساتھ بھیجتے ہیں اس حوالے سے ان کی جزئیات نگاری کا کمال دیکھئے۔

> ''بہر حال بہ ہزار گریہ وزاری سپھر آرا خود بھی روئی اور سارے کنبے کو رُلا کر دولھا کے گھر ساتھ روانہ ہوئی۔ دولھا پشتِ توسن پر سوار فنس میں دلہن پر میزاد رشکِ شمشاد، غیرتِ گلر خاں نوشاد، جہیز میں گیارہ پلّے چاندی کا سامان اور دو پلّے سونا تھا۔ علاوہ اس کے ہاتھی، پالکی، گھوڑا، بگھی ایک سو اکتالیس کشتیاں جوڑوں کی گیارہ مامائیں، سترہ چھوکریاں، سات خواصیں، چار مغلانیاں، دوآتون، پانچ مشعلچن وغیرہ وغیرہ دیے گئے۔ بڑے تزک واحتشام سے آتشبازی چھٹتی ہوئی بجلی کی روشنی اور ماہتاب نورعلی نور چاند بھی مات ہوا جاتا تھا۔ اس شاہانہ ٹھاٹھ کے ساتھ فنس کے داہنے بائیں مورچھل اڑتا ہوا دولھا مع دولھن کے اپنے عشرت کدے میں داخل ہوا۔ دونوں کے پاؤں دودھ سے دھلائے گئے۔'' ۵۹

ناول ''بزمِ خیال'' مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کا ضخیم اور آخری ناول ہے۔ چنچل نار کے 6 سال بعد بزم خیال کو لکھا۔ اس ناول میں کشن پرشا کی تخلیقی قوت پوری شدت کے ساتھ بروئے کار آ گئی ہے۔ وہ قلم کے ذریعہ بھی قوم کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ اس ناول میں مذہب واخلاق کے ساتھ حسن وعشق اور سماجی وتہذیبی مظاہر کے نمونے نکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

انھوں نے اپنے ناولوں میں سیاسی حالات کو پیش نہیں کیا۔ فنی اعتبار سے ان کے ناول بہترین ناولوں میں شمار نہیں کئے گئے اور اردو ادب میں ان کے ناولوں کو خاص جگہ نہیں ملی یا ان کے ناولوں پر کسی نے تفصیلی روشنی نہیں ڈالی۔ اور فکری اعتبار سے یہ ہلکے پھلکے ناول سمجھے جاتے ہیں۔

اس لئے ناقدین نے ان ناولوں کو فنی اعتبار سے قابل اعتنا نہیں سمجھا پھر بھی ان کے ناولوں میں فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ اپنے عہد کی اجتماعی زندگی کے اہم مسائل کو پیش نہیں کرتے ہیں بلکہ نوابی گھروں کے چند تہذیبی و معاشرتی پہلوؤں کی تفصیلات ملتی ہیں۔ ان سے اس عہد کی جاگیردارانہ تہذیب کے ایک

خاص رخ کی بھی جھلک نظر آتی ہے جوانھوں نے اپنے ناولوں میں درباری زبان اور بیگماتی زبان، شاہی پکوان، لباس، زیورات، شادی، بیاہ کے رسم ورواج کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔اس دور کی تہذیب کو انھوں نے اپنے ناولوں میں کرداروں کے مکالموں کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ناول کا پلاٹ مربوط ہے۔زبان و بیان اور زماں ومکاں کے اعتبار سے بھی یہ ناول عمدہ ہے۔اورقدرت کے مناظر کو شآد نے اپنے ناول میں بہت خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے پڑھتے وقت یہ سارے منارہمارے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔گویا ہم ایسا محسوس کرتے ہیں کہ خود اپنے آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس ناول میں کشن پرشاد نے کرداروں کا بہترین نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔

ان کے مکالمے سے کردار کی سماجی حیثیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔کہیں کہیں ان کے مکالمے طویل ہیں۔اس طرح کے مکالمے میں مصنف کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے ایسا لگتا ہے کہ کردار نہیں بول رہے ہیں بلکہ ناول نگار اپنے خیالات کا اظہار کررہا ہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد شآد کا ناول ''بزمِ خیال'' میں نذیر احمد کا ناول ''مراۃ العروس'' کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔نذیر احمد نے اصغری کے کردار کے ذریعہ مختلف علوم کا مطالعہ کرایا ہے۔مہاراجہ کشن پرشاد شآد نے بھی اسی طرح ''بزم خیال'' میں مختلف علوم سے واقف کرایا ہے۔

مہاراجہ سرشار کی ناول نگاری سے بہت متاثر تھے۔اپنے ناولوں میں انھوں نے سرشار کے اسلوب کو اپنانے کی کوشش بھی کی ہے۔زبان و بیان، کردار کی پیش کش یہاں تک کہ کراروں کے مکالمے بھی اوران کے وضع وقطع بھی سرشار کے ناولوں کے کرداروں جیسے ہیں۔

حوالے

۱۔ ناول ''بزم خیال'' مہاراجہ پرشاد شاد، 1909ء، ص:21

۲۔ ایضاً " " "ص:39

۳۔ ایضاً " " "ص45

۴۔ ایضاً " " "ص54

۵۔ ایضاً " " "ص64-65

۶۔ ایضاً " " "ص65

۷۔ ایضاً " " "ص66-67

۸۔ ایضاً " " "ص68

۹۔ ایضاً " " "ص104

۱۰۔ ایضاً " " "ص125

۱۱۔ ایضاً " " "ص133

۱۲۔ ایضاً " " "ص204

۱۳۔ ایضاً " " "ص229

۱۴۔ ایضاً " " "ص246

۱۵۔ ایضاً " " "ص255-256

۱۶۔ ایضاً " " "ص260-261

۱۷۔ ایضاً " " "ص22

۱۸۔ ایضاً " " "ص39
۱۹۔ ایضاً " " "ص42
۲۰۔ ایضاً " " "ص94
۲۱۔ ایضاً " " "ص131
۲۲۔ ایضاً " " "ص198
۲۳۔ ایضاً " " "ص198
۲۴۔ ایضاً " " "ص202
۲۵۔ ایضاً " " "ص203-204
۲۶۔ ایضاً " " "ص222
۲۷۔ ایضاً " " "ص232
۲۸۔ ایضاً " " "ص261-262
۲۹۔ ایضاً " " "ص327
۳۰۔ ایضاً " " "ص333
۳۱۔ ایضاً " " "ص336
۳۲۔ ایضاً " " "ص343-344
۳۳۔ ایضاً " " "ص2-3
۳۴۔ ایضاً " " "ص4-5
۳۵۔ ایضاً " " "ص64-65
۳۶۔ ایضاً " " "ص65-66
۳۷۔ ایضاً " " "ص77
۳۸۔ ایضاً " " "ص151
۳۹۔ ایضاً " " "ص153-154

۴۰۔ ایضاً " " "ص162

۴۱۔ ایضاً " " "ص165

۴۲۔ ایضاً " " "ص167-169

۴۳۔ ایضاً " " "ص175

۴۴۔ ایضاً " " "ص190-191

۴۵۔ ایضاً " " "ص190-191

۴۶۔ ایضاً " " "ص199

۴۷۔ ایضاً " " "ص199-200

۴۸۔ ایضاً " " "ص201

۴۹۔ ایضاً " " "ص202-204

۵۰۔ ایضاً " " "ص222

۵۱۔ ایضاً " " "ص223

۵۲۔ ایضاً " " "ص225

۵۳۔ ایضاً " " "ص226-227

۵۴۔ ایضاً " " "ص227

۵۵۔ ایضاً " " "ص299

۵۶۔ ایضاً " " "ص230-231

۵۷۔ ایضاً " " "ص232

۵۸۔ ایضاً " " "ص234

۵۹۔ ایضاً " " "ص240-241

اختتامیہ

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی، نظم، نثر، سفرنامے، خطوط، متفرقات کے علاوہ ناول بھی لکھے ہیں۔ شاؔد نے تقریباً 100 سے زیادہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ کشن پرشاد شاؔد میر محبوب علی خاں اور عثمان علی خاں کے دورِ حکومت میں 22 سال تک مدارالمہام اور وزرائے اعظم کے عہدوں پر فائز رہے۔ ان کو اردو ادب سے خاص دلچسپی تھی اسی دلچسپی کی بدولت انھوں نے متعدد کتابیں اور ناول بھی لکھے۔ سیاسی مصروفیات کی وجہ سے وہ کسی ایک صنف میں اپنا قدم نہیں جما پائے۔ ان کے کئی اردو اور فارسی کے شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ وہ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ ان کے دربار میں متعدد شعراء موجود رہتے تھے۔

مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد حیدرآباد کے پہلے ناول نگار تھے۔ انھوں حیدرآباد میں اردو ناول کی بنیاد ڈالی۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناولوں سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ خاص کر 'فسانۂ آزاد' کو بہت شوق سے پڑھتے تھے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار مہاراجہ کے دربار میں ایک اچھے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے تھے۔ کشن پرشاد سرشار کو عزیز رکھتے تھے اور ان کو اپنا کلام نظم و نثر دکھاتے تھے اور ان سے اصلاح کراتے تھے۔ کشن پرشاد شاؔد نے سرشار کے ناول لکھنے کے اسلوب کو اپنانے کی کوشش کی اور اسی طرز میں ناول لکھے۔ ان کے ناول یہ ہیں۔

۱۔ سرمایۂ سعادت 1887ء یہ مختصر سا قصّہ ہے۔
۲۔ مطلع خورشید 1897ء
۳۔ چنچل نار 1903ء
۴۔ بزمِ خیال (یہ تین حصوں پر مشتمل ہے) 1909ء
۵۔ فسانۂ شیدا۔

فسانۂ شیدا دستیاب نہیں ہے۔ اس ناول کا ذکر ڈاکٹر حبیب ضیاء نے اپنی کتاب ''مہاراجہ سرکشن

پرشاد شآد حیات اور ادبی خدمات'' میں کیا ہے۔لیکن انھیں بھی یہ ناول کہیں نہیں ملا اور مہاراجہ کے دور میں ہی یہ شائع نہیں ہوا تھا جیسا خود انہوں نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

کشن پرشاد شآد نے اپنے ناولوں میں معاشرتی زندگی کی تصویر کھینچی ہے۔ان کے ناول اخلاقی ہیں۔انھوں نے حسن و عشق کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔1857ء کے غدر کے بعد یہ اردو میں ناول لکھنے کا رواج ہوا۔سب سے پہلے معاشرتی اصلاح کے لئے ناول لکھے گئے۔کشن پرشاد نے بھی ناول کی صنف سے متاثر ہوکر تین ناول لکھے۔ایک کہانی بھی لکھی۔ جب ان کے ناولوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں ناول لکھنے کی صلاحیت موجود تھی۔میرے خیال سے ان کے ناول اس دور میں منظر عام پر نہیں آئے۔اور آئے بھی ہیں تو مصنفوں اور ادیبوں کے نظروں سے نہیں گزرے ہوں گے۔صرف ایک ناول ''چنچل نار'' کا ہی چرچہ اور ذکر چند مصنفیں نے کیا ہے۔

کشن پرشاد سرمایہ سعادت میں شادی کے رسم و رواج کو بھی بیان کیا ہے۔جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کیا رسم و رواج ہوتے ہیں۔اس کو بھی بیان کیا ہے۔مہاراجہ کشن پرشاد نے سرمایہ سعادت میں خطوط کی تکنیک کو بھی استعمال کیا ہے۔فریس آگ کے حادثہ کے بارے میں اپنے بھائی اور بھابھی ماں کو پورا واقعہ لکھ کر بھیجتا ہے۔اس کے بعد فریس اپنے گھر آجاتا ہے اور سب مل جل کر اتفاق سے زندگی گذارتے ہیں۔

''سرمایہ سعادت'' کا اختتام کشن پرشاد نے طربیہ انداز میں کیا ہے۔اس کا پلاٹ سیدھا سادہ ہے۔رئیس اور قمرالنساء متاثر کن کردار ہیں

مہاراجہ کشن پرشاد شآد ناول لکھنے کا شوق رکھتے تھے۔انھوں نے ناول لکھنے کا اسلوب پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناول ''فسانۂ آزاد'' سے لیا ہے۔اور انھوں نے تمام ناول ''فسانۂ آزاد'' کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔فسانۂ آزاد کے کرداروں کے نام، بیگماتی زبان، محاورے، مثالیں اور ضرب الامثال کو بھی انھوں نے اپنے ناولوں میں استعمال کیا ہے۔کشن پرشاد نے اس ناول میں جگہ جگہ اردو اور فارسی اشعار کو بھی پیش کیا ہے۔

کشن پرشاد اپنے ناولوں میں جذبات کے اتار چڑھاؤ کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔انسانی فطرت کو بہترین طریقہ سے پیش کرتے ہیں۔وہ سماج کے مختلف پہلوؤں اور رنگوں کو مختلف طبقوں کے

کرداروں کے ذریعہ پیش کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ ہر کردار اپنے طبقے کی پوری نمائندگی کرتا ہے۔

خوجی جیسا ایک کردار اپنے ناول ''مطلع خورشید'' میں پیش کیا ہے۔اس ناول میں میاں کبڑے کا کردار مزیدار اور پر لطف ہے۔نواب مرزا مخمور اس ناول کے ہیرو ہیں۔مرزا فرخ اور میاں کبڑے ان کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں۔میان کبڑے اس لئے مشہور تھے کہ ماں کے پیٹ ہی سے کمر خمیدہ دنیا کی سیر کرنے تشریف لائے تھے۔ان کی عمر پچاس سال کی ہے۔اس ناول میں میاں کبڑے کا کردار اہم ہے۔

چنچل نار میں ہندو تہذیب اور رسم ورواج کو بیان کیا ہے۔ پاروتی ایک خوش مزاج، شوخ چنچل لڑکی ہے۔لیکن وہ اپنے نفس پر قابو رکھتی ہے۔اپنے ماں باپ کی عزت کرتی ہے۔ یہ اپنے مذہب کی پابندی کرتی ہے۔ ماں باپ کی بات مانتی ہے۔اس ناول میں جگہ جگہ فارسی اور اردو اشعار درج ہیں اور جگہ جگہ محاورے بھی شامل ہیں۔کشن پرشاد شاؔد اپنے تمام ناولوں میں قدیم املا کو استعمال کرتے ہیں۔

''چنچل نار'' میں کشن پرشاد نے عمدہ منظر نگاری کی ہے اور خدا کے حسین کارناموں کو اس ناول میں پیش کیا ہے۔منظر نگاری کی وجہ سے ناول میں دل کشی پیدا ہوگئی ہے۔حسن و تاثر میں اضافہ ہوتا ہے۔اس ناول کا پلاٹ مربوط ہے۔ یہ ایک رومانی ناول ہے۔اس ناول میں کرداروں کی نفسیات کو بھی اجاگر کیا ہے

کردار نگاری کے لحاظ سے بھی یہ ناول اہمیت رکھتا ہے۔اس ناول میں شاؔد نے بہت سے کردار پیش کئے ہیں اور ہر کردار کی انفرادیت کو پوری طرح نمایاں کرتے ہوئے اس کے احساسات اور نفسیات کی فن کارانہ عکاسی کی ہے۔انھوں نے پاروتی کے اطراف گھومتی رہتی ہے۔انھوں نے اپنے ناولوں میں کہیں بھی سیاسی منظر کو پیش نہیں کیا۔صرف مذہبی، اخلاقی اور سماجی مسائل پر اپنا قلم اٹھایا ہے۔اس لئے شاید ان کے ناولوں کو اردو ادب میں خاص جگہ نہیں دی گئی۔اور ان کے ناولوں کو بہترین ناولوں میں شمار نہیں کیا گیا۔ان کے ناولوں کو وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق ہیں۔ یہ ہلکے پھلکے ناول سمجھے جاتے ہیں۔کشن پرشاد نے اپنے اپنے عہد کی اجتماعی زندگی کے اہم مسائل کو نہیں چھیڑا بلکہ امراء اور نوابی گھروں کے چند پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔زبان و بیان اور زماں و مکاں کے اعتبار سے یہ عمدہ ناول ہے۔جذبات نگاری اور منظر نگاری بھی ان کے ناول میں قابل تعریف ہے۔

ان کے ناول چنچل نار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کشن پرشاد کی تصنیف نہیں بلکہ اس کے خالق پنڈت رتن ناتھ سرشار ہیں۔ ناول 'چنچل نار' نہ تو سرشار کا ہے اور نہ تو اختر مینائی کا۔ یہ صرف مہاراجہ کشن پرشاد شآد کا ناول ہے۔ کشن پرشاد شآد نے 'چنچل نار' کے علاوہ دوسرے ناول بھی لکھے۔ جب ان ناولوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سرشار کی طرز میں ناول لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

کشن پرشاد شاد کے تمام ناولوں کی کہانی اور واقعات میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ سرمایۂ سعادت میں ایک حادثاتی واقعہ کو بیان کیا ہے۔ کلکتہ کے ایک ہوٹل میں بجلی گرنے سے آگ لگ جاتی ہے اور مطلع خورشید میں برات کے وقت دولہا گھوڑے سے گر کر مر جاتا ہے اس کا بیان ہے اور 'چنچل نار' میں پنڈت دین دیال کے نئے مکان میں آگ لگ جاتی ہے جہاں بوڑھی اور جوان عورتیں تہورا کی خوشی میں رام سیتا کے بھجن کے بعد گانا وانا گاتی رہتی ہیں۔ آگ کی وجہ سے چند عورتیں زخمی ہو جاتی ہیں۔ رام دیال نامی شخص آخر ان کو آگ سے بچاتا ہے۔ اور ناول 'بزمِ خیال' میں 1908ء کی طغیانی کے واقعات کا بھی ذکر ہے۔

ہر ناول میں انھوں نے عشق و عاشقی اور مذہبی اقدار کو پیش کیا ہے اور اس دور کے نوابی گھرانوں کی پرورش، تعلیم اور اچھے اخلاق پر زور دیا ہے۔ ان کے ہر ناول میں شادی بیاہ کے رسم و رواج، رہن سہن، پکوان، لباس، زیورات کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس طرح سے ان کے سب ناولوں میں کچھ واقعات اور تہذیبی سماجی لوازمات کے تذکرے میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔

کشن پرشاد کے ناولوں میں فارسی اور عربی کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ عربی اور فارسی کے الفاظ کے علاوہ جملوں کی ساخت، تراکیب، محاورے، ضرب الامثال، تلمیحات، اضافتیں اور اشعار وغیرہ بھی زیادہ تر انھیں زبانوں کے استعمال کئے ہیں۔ اس قسم کی طرز تحریر کا عکس پورے ناولوں میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

خط و کتابت بھی تہذیب کی ایک نشانی سمجھی جاتی ہے۔ خطوط کے ذریعہ اپنے دل کا حال خادمہ کے ہاتھ محبوب یا عاشق تک پہنچانا دراصل داستانوی اثرات کی نشاندہی کرتا ہے۔ داستانوں میں ایسے ہی خط کے ذریعہ محبوب کو پیغام رسائی جاتی تھی۔ شآد کے ناولوں کو پڑھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان کے ناولوں پر

داستانوں کے اثرات کے اسباب کیا ہیں۔ دراصل شاؔد جاگیردارانہ تہذیب کے پروردہ تھے۔ان کے سامنے قصّے، کہانیاں داستانوں کی شکل میں نمونے کے طور پر موجود تھیں۔

''بزمِ خیال'' کشن پرشاد شاؔد کا ضخیم ناول ہے۔ چنچل نار لکھنے کے 6 سال بعد اس ناول کو لکھا۔ اس ناول میں انھوں نے اپنی تخلیقی قوت کو پوری شدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ قلم کے ذریعہ بھی قوم کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔اس ناول میں انھوں نے تعلیم اور مذہبی

اخلاق کو اپنا موضوع بنایا۔انھوں نے اپنے ناولوں میں سماجی پس منظر کو پیش کیا۔مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کے ناولوں کو جگہ نہیں ملی۔ یہ صحیح ہے ہ ان کے ناول فکری وفنی اعتبار سے زیادہ بلند نہیں ہیں مگر اخلاقی وتہذیبی پس منظر کے حوالے سے ایک مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں حیدرآباد کی تہذیب رسم ورواج نوابی زبان، شریف گھرانوں کی تہذیب کو اجاگر کیا ہے۔انھوں نے فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ اپنے عہد کی اجتماعی زندگی کے اہم مسائل کو نہیں چھیڑا بلکہ نوابی گھروں کے چند پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اس دور کی تہذیب کو انھوں نے اپنے ناولوں میں کرداروں کے مکالموں کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ ان سے اس عہد کی جاگیردارانہ تہذیب کے ایک خاص رخ کی بھی جھلک نظر آتی ہے۔ان کے ناولوں میں درباری زبان اور بیگماتی زبان، شاہی پکوان، لباس، زیورات، شادی، بیاہ کے رسم و رواج کا تفصیل سے بیان ملتا ہے۔ اس دور کی تہذیب کو انھوں نے اپنے ناولوں میں کرداروں کے مکالموں کے ذریعہ پیش کیا ہے۔مہاراجہ سرشار کی ناول نگاری سے بہت متاثر تھے۔اپنے ناولوں میں انھوں نے سرشار کے اسلوب کو اپنا نے کی کوشش بھی کی ہے۔زبان و بیان، کردار کی پیش کش یہاں تک کہ کراروں کے مکالمے بھی اوران کے وضع وقطع بھی سرشار کے ناولوں کے کرداروں جیسے ہیں۔

ان کے ناولوں میں دلچسپی کے عناصر بھرے ہوئے ہیں۔قدرت کے مناظر کو شاؔد نے اپنے ناولوں میں بہت خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے۔ ناولوں کو پڑھتے وقت یہ سارے مناظر ہمارے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ان کے ناولوں کے پلاٹ سیدھے سادھے ہیں اور واقعات میں ربط وتسلسل بھی موجود ہے۔میرے خیال میں ان کے ناول اردو ناول نگاری کی تاریخ میں جگہ پانے کے مستحق ضرور ہیں۔

کتابیات

کتابیات

بنیادی ماخذ

سلسلہ نمبر	مصنف کا نام	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
۱	مہاراجہ کشن پرشاد شآد	سرمایۂ سعادت	حیدرآباد، دکن	1887ء
۲	مہاراجہ کشن پرشاد شآد	مطلع خورشید	حیدرآباد، دکن	1897
۳	مہاراجہ کشن پرشاد شآد	چنچل نار	حیدرآباد، دکن	1903ء
۴	مہاراجہ کشن پرشاد شآد	بزم خیال	حیدرآباد، دکن	1909ء

ثانوی ماخذ

سلسلہ نمبر	مصنف کا نام	کتاب کا نام	سنہ اشاعت	سنہ مقام
۱	ابوالکلام قاسمی	ناول کا فن	ایجوکیشنل، بک ہاوس، علی گڑھ	2015ء
۲	احمد الدین علی خاں	عہد عثمانی میں اردو خدمات	دبستانِ دکن، حیدرآباد	1979ء
۳	اعجاز علی ارشد	نذیر احمد کی ناول نگاری	دی آرٹ پریس، پٹنہ	1984ء
۴	افضل العلما مولوی سبحان بخش	محاوراتِ ہند	مطبع مجتبائی، دہلی	1980ء

۵	اقبال جہاں قدیر	حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب	ملکی پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد	1985ء
۶	انتظار مرزا، ڈاکٹر	دلی کی تہذیب (سیمنار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ)	اردو اکیڈیمی، دریا گنج، نئی دہلی	1987ء
۷	آغا حیدر حسن، پروفیسر	حیدرآباد کی سیر	او۔ ایس۔ گرافکس، حیدرآباد	1997ء
۸	تسکین عابدی	سخن ورانِ دکن یعنی عہد عثمانی کے اردو شعرا کا تذکرہ	حیدرآباد، دکن	1938
۹	حبیب ضیاء اور رحیم الدین انصاری	گلدستۂ شاؔد	اردو اکیڈیمی، آندھرا پردیش	2009ء
۱۰	حبیب ضیاء، پروفیسر اور نارائن راج، ڈاکٹر	نذر شاد	اردو اکیڈیمی، آندھرا پردیش	2009ء
۱۱	حبیب نثار، ڈاکٹر	دکنی کی مخصوص شعری اصناف (اور دوسرے مضامین)	اردو ریسرچ سنٹر، حیدرآباد	1995ء
۱۲	رئیس احمد جعفری	حیدرآباد جو کبھی تھا۔	حسامی بک ڈپو، حیدرآباد	1996ء
۱۳	سنجیدہ خاتون	بیسویں صدی کے اردو مصنفین	بھارت آفسیٹ، دہلی	2004ء
۱۴	سید داؤد اشرف، ڈاکٹر	حرفِ اعتبار (معتبر شخصیتوں سے انٹرویو اور مستند تحریروں سے اخذ کردہ مواد پر مبنی تحقیقی مضامین)	شگوفہ پبلی کیشنز، حیدرآباد	2001ء

۱۵	سید داوٗد اشرف	حیدرآباد کے علمی فیض رسانی	شگوفہ پبلی کیشنز، حیدرآباد	2009ء
۱۶	شیلا راج، ڈاکٹر	شاہانِ آصفیہ کی رواداری اور ہندو مسلم روایات	ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، حیدرآباد	2007ء
۱۷	شریف احمد قریشی	فسانۂ آزاد اور اس کا عمرانی، لسانیاتی مطالعہ	خسرو باغ کالونی، رام پور، یو۔پی	2003ء
۱۸	طیبّہ بیگم	میر عثمان علی خاں اور ان کا عہد	انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش	2000ء
۱۹	عثمانیہ یونیورسٹی	مجلّۂ عثمانیہ، مہاراجہ نمبر	اعظما سٹیم پریس گورنمنٹ، ایجوکیشنل پرنٹرز، حیدرآباد	1940ء
۲۰	عابد معز	واہ حیدرآباد	مکتبۂ ابراھیم، مصطفیٰ بازار، حیدرآباد، دکن	1994ء
۲۱	عظیم الشان صدیقی	اردو ناول آغاز و ارتقاء (1857 تا 1914)ء	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی	2008ء

۲۲	عاشور کاظمی، سید	بیسویں صدی کے اردو نثر نگار	انجمن ترقی اردو، ہند، نئی دہلی	2001ء
۲۳	علی عباس حسینی	ناول کی تاریخ اور تنقید	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	1998ء
۲۴	کامل قریشی، ڈاکٹر	اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب	اردو اکیڈیمی، دریا گنج، نئی دہلی	1986ء
۲۵	محمد منظور احمد	مضامین محمد منظور احمد	ادبی مرکزی، چھتہ بازار، حیدرآباد	1986ء
۲۶	محمد مجیب	تاریخِ تمدن ہند	عثمانیہ یونیورسٹی پریس، حیدرآباد، دکن	1951ء
۲۷	معین الدین عزمؔی	حیدرآباد ماضی کے جھروکوں میں	عائیش آفسیٹ پرنٹرس، حیدرآباد	2005ء
۲۸	مولوی غلام پنجتن صاحب شمشادؔ	حیدرآباد کے بڑے لوگ	اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدرآباد	1957ء
۲۹	محمد اسحاق	تعلیم ایک تحریک اور متفرق مضامین	آل انڈیا نیشنل مومنٹ ابولفضل ینکلیو، نئی دہلی	2003ء
۳۰	محمد اعجاز الدین حامدؔ	حیدرآباد دکن کے اردو اخبارات ازابتداء تا 1947ء	القلم پبلیشرز سعید آباد، حیدرآباد	1993ء

۳۱	محی الدین قادری زورؔ، ڈاکٹر	ادبی تحریریں		
۳۲	محی الدین قادری زورؔ، ڈاکٹر	داستان ادب حیدرآباد	ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد	1982ء
۳۳	مسز عسکری صفدر	حیدرآباد کی شاعرات		2008ء
۳۴	موہن پرشاد	حیدرآباد فرخندہ بنیاد	ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد	2001ء
۳۵	مہدی نواز جنگ	مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی زندگی کے حالات	حیدرآباد، دکن	1900ء
۳۶	نصیرالدین ہاشمی	دکنی ہندو اور اردو	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	1984ء
۳۷	نصیرالدین ہاشمی	دکنی کلچر	مجلس ترقی ادب، لاہور	1963ء
۳۸	نصیرالدین ہاشمی	دکن میں اردو	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	1985
۳۹	نگینہ جبین	اردو ناول کا سماجی و سیاسی مطالعہ	کیشو پرکاشن، الہ آباد	2002ء

۴۰	وزیر آغا	نئے تناظر	حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدر آباد	1978ء
۴۱	ولی الدین قریشی	مسلم ہند کے علمی، فکری سیاسی اور ثقافتی میں حیدر آباد دکن کا کردار	حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدر آباد	1978ء
۴۲	یوسف سرمست، ڈاکٹر	بیسویں صدی میں اردو ناول نگاری	نیشنل بک ڈپو، مچھلی کمان حیدر آباد	1973ء

رسائل

۱۔	سب رس،	حیدرآباد،	جولائی	1940
۲۔	سب رس،	حیدرآباد،		1938
۳۔	سب رس	حیدرآباد،	جون	1940
۴۔	سب رس	ایوان اردو کراچی،	اگست	1986
۵۔	نقوش لاہور، مکاتیب نمبر		ستمبر،نومبر	1957ء
۶۔	منصف روزنامہ			1-1-2013
۷۔	سب رس،	حیدرآباد،	جون	1941ء
۸۔	سب رس،	حیدرآباد،	مئی	1941ء
۹۔	سٹی کالج میگزین،	حیدرآباد،	مارچ	1958ء
۱۰۔	ہماری زبان،	علی گڑھ	18اگست	1959
۱۱۔	سب رس	حیدرآباد،	اپریل	1984
۱۲۔	قومی آواز،	حیدرآباد	نومبر	1977
۱۳۔	سب رس	حیدرآباد	جولائی	1977
۱۴۔	سب رس،	حیدرآباد،	جولائی	1968
۱۵۔	ہماری زبان	علی گڑھ	15/دسمبر	1960

کتب خانے

۱۔ اندرگاندھی میموریل لائبریری۔حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی،حیدرآباد

۲۔ ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گتہ،حیدرآباد

۳۔ عثمانیہ لائبریری،عثمانیہ یونیورسٹی،حیدرآباد

۴۔ شاؔد لائبریری،شالی بنڈہ،حیدرآباد

۵۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی،حیدرآباد

۶۔ سالار جنگ میوزیم لائبریری،حیدرآباد

۷۔ آصفیہ سنٹرل لائبریری،افضل گنج،حیدرآباد

۸۔ مولانا آزاد نیشنل ریسرچ سنٹر،حیدرآباد

۹۔ اقبال اردو اکیڈیمی،حیدرآباد